حالم

دوری نگارہ ملایو

The Thorn of Malaya

(ملایا کا کانٹا)

حالم: نمرہ احمد

باب: 16

نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح گھر کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی



مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمٰن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پھلا نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہر وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو

جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک "الہو" قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جُل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم "ہنگارایا ملایو" کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو "وانگ لی" کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن باؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مورخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پہ بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مورخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پہ چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کانی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سوفو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

-16-
سولہویں قسط

”کبھی تاریخ کی کتابیں پڑھو تو جانو گے کہ دنیا کے عظیم حکمران..... جو شاطر سے شاطر دشمن کے سامنے بھی سیسہ پلائی دیوار بن جاتے تھے جن کے پہاڑ جیسے ارادوں سے مکار دشمن مات کھا جاتا تھا.... اپنی ساری عقل و سمجھ کے باوجود.... ایک وقت آتا تھا جب وہ کسی عورت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ عورتوں کے فریب سے کسی کو پناہ نہیں، ابوالخیر۔ ملکہ یان سوفو اور شہزادی تاشہ..... یہ دونوں مرسل شاہ کو اپنے اپنے فریب میں الجھا کے اسے ہمارے لیے ناکارہ بنا رہی ہیں۔“

”لیکن شہزادی کی تو شادی ہونے والی ہے سلطان سے۔“ وہ متعجب ہوا۔

”اور اگر نہ ہو سکی تو مرسل میرے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تم میری مدد کرو گے۔“

”میں آپ کے ساتھ ہوں، راجہ! لیکن.....“ وہ رکا اور سوچنے والے انداز میں داڑھی کھجائی۔

”لیکن مجھے کیا ملے گا، راجہ؟ میری آپ سے وفاداری کا انعام؟“

مراد راجہ اٹھا اور قبا کو ہلکا سا جھٹکا دے کے درست کیا۔ ”جس دن میں سلطان بنا، تم میرے بنداہارا ہو گے اور وہ دن بہت سا خون بہانے کا دن ہوگا۔“

ابوالخیر زیرِ لب مسکرایا اور ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں، راجہ! بہت سے صوبوں کے گورنر بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ آپ جب حکم دیں گے، ساری فوجیں آپ کے ساتھ آ کھڑی ہوں گی۔“

اب وہ دونوں کھڑکی سے آتی روشنی کے ہالے میں کھڑے تھے۔

تیز چمکتی دھوپ کا ہالہ جو جہنم کی آگ جیسا دہک رہا تھا۔

☆☆☆

وانگ لی کا قہوہ خانہ ”جیا“ اس دوپہر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وسیع ہال کمرے میں کرسیاں میزیں اور فرشی نشستیں لگی ہوئی تھیں اور غلام بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ وہ باتیں کرنے کے بجائے جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈال رہے تھے۔

تب ہی قہوہ خانے کا دروازہ کھلا تو چوکھٹ سے بہت سی روشنی اندر آئی۔ چند ایک لوگوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہاں چغہ پہنے، سر پہ ٹوپی جمائے ایک ہیولہ نظر آیا۔ چونکہ وہ دھوپ میں کھڑا تھا اس لیے اس

کا چہرہ واضح نہ تھا۔

پھر وہ شخص آگے بڑھنے لگا۔ میزوں کی قطار کے درمیانی راستے پہ قدم قدم چلنے لگا۔ چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔

بہت سی گردنیں مڑیں مگر وہ سیدھ میں چلتی آگے آئی اور اس اونچے چبوترے پہ جا کھڑی ہوئی جہاں کبھی وان فاتح کھڑا ہو کے اپنی قوم کے لوگوں کو پکارا کرتا تھا۔

”کیا تم لوگوں نے اس شخص کو بھلا دیا ہے جو تمہیں اپنے لیے کھڑا ہونے کی تلقین کرتا تھا؟“ چغے کی ٹوپی پیچھے گرائی تو سنہری بالوں کے ہالے میں دمکتا چہرہ سامنے آیا۔ ماتھے پہ بل تھے اور سیاہ آنکھیں ایک سے دوسرے کی طرف سفر کر رہی تھیں۔

لوگوں کی چہ مگوئیاں دم توڑ گئیں۔ سکوت سا چھا گیا۔ نوالوں والے ہاتھ ـــــ رک گئے۔ نظریں چبوترے پہ کھڑی چغہ پوش سنہرے بالوں والی لڑکی پہ جم گئیں۔

”کیا تمہیں وہ بہادر غلام یاد ہے جو کسی انسان سے نفع نقصان کی امید نہیں رکھتا تھا؟ نہ وہ کسی سے ڈرتا تھا۔“

وہ ماتھے پہ بل ڈالے کہہ رہی تھی اور لوگ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

(تین چاند والے جزیرے کے ساحل پہ ایڈم اور سارے سپاہی اب گروہ کی صورت بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں بار بار سمندر سے خالی لوٹ آتیں تو بے اختیار ایڈم کی طرف اٹھتیں جو بہت امید سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔)

”وہ دلیر غلام تمہارے حق کے لیے آواز اٹھانے بنداہارا کے پاس گیا تھا۔ اس نے بنداہارا سے کہا کہ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا اس لیے وہ تمام ناجائز غلاموں کو آزاد کر دے۔“

(مراد راجہ اور ابوالخیر ایک نیم روشن کمرے میں میز کے گرد کھڑے تھے۔ میز کی سطح پہ زرد کاغذ والا نقشہ پھیلا رکھا تھا۔ مراد انگلی جگہ جگہ رکھے نئی حکمت عملی سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔)

”اور جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کو مراد راجہ نے قید کر دیا اور اس کو اتنا مارا کہ اس کی ہر رگ سے خون بہنے لگا۔“

(وان فاتح خاموش تاریک کوٹھڑی میں دیوار سے لگا بیٹھا، دیوار پہ لگی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے پہرے دار کو آواز دے کر وقت پوچھا۔ جواب ملنے پہ اس نے ناخن سے ایک لکیر مزید کھینچی۔ وقت قریب آ پہنچا تھا۔)

”اب تم لوگ مفت کی وہ روٹی توڑ رہے ہو جو اس کی وجہ سے تمہیں ملی تھی۔ کیا تم نے اس کو ایک دفعہ بھی یاد نہیں کیا جو تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال بیٹھا ہے؟“

(غلام اور کنیزیں سلطنت محل کے ایک حصے کو از سرِ نو سجانے میں مشغول تھے۔ اپنے خاص مشیروں کے ہمراہ سلطان مرسل راہداری میں گھومتا، کمر پہ ہاتھ باندھے، خوش باش سا تیاریوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ حرم شہزادی تاشہ کے لیے آراستہ کیا جا رہا تھا۔)

”اگر وہ مر گیا تو کون تمہارے لیے دوبارہ کھڑا ہوگا؟ کون تمہارے لیے لڑے گا؟ ملاکہ کے لوگو! تم کب تک اپنے مالکوں سے ڈرتے رہو گے؟“ چغہ پوش لڑکی کرب سے کہہ رہی تھی اور سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

(ساحل کی ریت پہ تھکے ماندے بیٹھے جرنیل نے شکایتی انداز میں ایڈم سے کچھ کہا مگر ایڈم جواب دینے کے بجائے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پانی کو دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے بھی چونک کے اس طرف دیکھا۔ دور سمندر پہ ایک بحری جہاز کے خدوخال دکھائی دیے تھے۔)

”کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اپنے خوف دور کر دو اور اس انسان کے لیے کھڑے ہو جاؤ جس کو تمہاری ضرورت ہے؟“

(ساحل پہ موجود سپاہیوں نے جھٹ سے

لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ شعلے جل اٹھے۔ ڈھلتی شام میں اس جہاز کو اشارہ دیا جانے لگا۔ خود ایڈم سرخ رومال ہاتھ میں لیے لہرانے لگا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ملکہ نے وعدہ پورا کر دیا تھا۔ چینی بحری جہاز پہنچ چکا تھا۔)

"کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہوتا ہے؟ کیا اپنے خیال رکھنے والے ساتھی کے لیے تم کوشش نہیں کر سکتے؟"

(جیا سے غلام نکل کے اپنے مالکوں کی حویلیوں کی طرف نہیں گئے تھے۔ وہ جوق در جوق بازاروں میں جا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ سر ایک دوسرے کے قریب جوڑے وہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔)

"کیا تم اس کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟ کیا تم اس کے لیے ویسے جان نہیں مارو گے جیسے اس نے تمہارے لیے ماری؟ کیسے دوست ہو تم لوگ؟"

(غلاموں کی سرگوشیوں نے قدیم ملاکہ کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مفلوک الحال، چیتھڑوں میں ملبوس جھلسی ہوئی جلد اور سخت چہروں والے غلام ڈھیرے دور دور سے اکٹھا ہو رہے تھے۔)

"دوستوں کے لیے تو جان تک دے دی جاتی ہے۔ اگر مشکل میں ایک دوسرے کے لیے وقت ہی نہیں نکالا تو پھر کیسے دوست ہوئے تم؟"

(بنداہارا کا محل پہاڑی پہ واقع تھا اور سامنے سڑک تھی جو اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سڑک کے نشیب میں ڈھیرے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ مگر وہ 'لوگ' نہیں تھے۔ وہ غلام تھے۔ مضبوط جسموں والے سخت جان غلام۔)

"اپنے کن مالکوں سے ڈرتے ہو تم؟ ان سے جنہوں نے تمہیں بھوک اور ظلم تلے پیس کے رکھا ہوا ہے؟ مسلمان ہونے کے باوجود غلام بنا رکھا ہے؟ جانتے ہو نا، مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ صرف غیر مسلم جنگی قیدی غلام بنتے ہیں۔"

(بنداہارا کے محل کے سامنے جمع لوگوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ان کے لب خاموش تھے۔ ان کی آنکھیں شکایتی تھیں۔ وہ بس چاروں سمت سے آتے اس مقام پہ بیٹھ رہے تھے جہاں سے سڑک اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سپاہی مستعد ہو گئے مگر قدرے الجھ بھی گئے۔ سامنے سڑک پہ بیٹھے بے ضرر لوگوں پہ وہ حملہ کرتے بھی تو کیوں؟)

"اگر آج تم اپنے ساتھی کے لیے نہیں کھڑے ہوئے تو کل کو تم میں سے ایک ایک کو مراد راجہ اٹھا کے اپنے قید خانے میں ڈال دے گا۔ ڈرو اس وقت سے۔"

(غلام کسی سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ بس زمین پہ اکڑوں بیٹھے، گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے خاموش نظروں سے اوپر محل کو دیکھ رہے تھے۔)

"اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرو اور وان فاتح کے لیے آواز بلند کرو۔ میں مراد راجہ کی بیٹی تاشہ بنت مراد ہوں اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی سپاہی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

(مراد راجہ نے کھڑکی سے ان غلاموں کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ ہر پل ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ جیا میں جس غلام نے ایک دفعہ بھی مفت کھانا کھایا تھا، وہ وان فاتح کے لیے ادھر آ کے بیٹھ گیا تھا۔)

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے مالک بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ تم حق کے ساتھ ہو۔ حق کے لیے کھڑے ہونے والوں کا ساتھ ہمارا رب تعالیٰ دیتا ہے۔"

(سپاہی بے بسی سے کبھی دور بیٹھے اس خاموش ہجوم کو دیکھتے، کبھی گردنیں اوپر کر کے کھڑکی میں کھڑے راجہ کو جس کا چہرہ سرخ دہک رہا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ میان پہ تھے مگر دونوں اطراف سے کوئی بھی حملے کا عندیہ نہیں دے رہا تھا۔ عجیب ہیجان سا ہیجان تھا۔)

"کیونکہ اگر آج تم نے مراد راجہ سے اس ظلم کا حساب نہ لیا تو اس کا ہاتھ نہیں رکے گا۔ خود کو کمزور سمجھنا چھوڑ دو۔"

(وہ مظلوم، کمزور لوگ چپ چاپ بیٹھے اوپر محل کی کھڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نہ نفرت تھی، نہ غصہ، نہ انتقام کی آگ۔ صرف شکوہ تھا۔ وہ بلی جیسی معصوم شا کی آنکھیں تھیں جو مراد راجہ کی کھڑکیوں پہ لگی تھیں۔ اس نے زور سے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور مڑا تو پیچھے تالیہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ سب تھا جو غلاموں کی آنکھوں میں نہ تھا۔)

"تم کمزور نہیں ہو۔ تم اس شہر کے سب سے طاقتور لوگ ہو۔ تمہیں اٹھنا ہے اپنے ساتھی کے حق کے لیے۔ تمہیں اٹھنا ہے ظلم کے خلاف۔"

(سرخ نشان والا بحری جہاز ساحل پہ لنگر انداز تھا۔ سپاہی صندوق اٹھا اٹھا کے اندر رکھ رہے تھے۔ ایڈم بن محمد عرشے پہ کھڑا، مسکراتا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا سے اس کے چینی کی ٹوپی گر گئی تھی اور بال ماتھے پہ بکھر گئے تھے۔ مگر اسے وہ تازگی بھری ہوا اچھی لگ رہی تھی۔)

"اور تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ تم لوگ آخر کیا کر سکتے ہو؟ تو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح تم مراد راجہ کے سارے محل کو ہلا کے رکھ سکتے ہو۔ نہ کسی تیر سے نہ تلوار سے۔ صرف اپنی ایک چپ سے۔"

☆☆☆

مراد نے کھڑکی کا پردہ زور سے جھٹکا اور تیوریاں چڑھائے پلٹا تو سامنے تالیہ کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ سرد نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا خوب صورت منظر ہے، بابا۔"

"تم نے..... تم نے کیا ہے یہ سب؟ تین دن شہر کے قہوہ خانوں میں جا کے میرے خلاف بولتی رہی ہو تم۔" مراد دانت پیس کے غصے سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔"

"ہٹاؤ ان لوگوں کو یہاں سے۔ ابھی اسی وقت۔" وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ بولا۔

"میں تو ان کو نہیں ہٹا سکتی۔ یہ اپنی مرضی سے آئے ہیں، اپنی مرضی سے جائیں گے۔"

"ہٹاؤ ان کو ورنہ محل کی چھت پہ بیٹھے تیر انداز ان کو چھلنی کر دیں گے۔"

"کن کو چھلنی کر دیں گے؟ ان غلاموں کو جو شہر کے روسا اور امراء کے سارے کام کرتے ہیں؟ ایسی غلطی مت کیجیے گا بابا۔ کیونکہ آج دوپہر سے ملاکہ کی اکثر اونچی حویلیاں خالی ہو چکی ہیں۔ مالک پریشان ہیں اور غلام غائب ہیں۔" وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ "غلام ہر معاشرے کا سب سے اہم رکن ہوتا ہے بابا! ارے آپ حکمران لوگ تو بل کے پانی بھی نہیں پی سکتے۔ ایسے میں یہ لوگ اگر بنا بتائے اپنی حویلیاں چھوڑ دیں تو سارے امراء گھٹنے ٹیک دیں۔"

"میں ان بے وقوف نیچ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ کتنی دیر بیٹھ سکتے ہیں یہ یہاں؟ ہاں؟"

"آپ بھول گئے ہیں۔ یہ غلام ہیں۔ عام عوام نہیں۔ ان کو کئی کئی دن کھانا نہیں ملتا۔ ان سے سخت سے سخت موسم میں بھی کام کروایا جاتا ہے۔ بھوک اور موسم کی سختی ان پہ اثر نہیں کرتی۔ یہ تب تک یہاں بیٹھیں گے جب تک آپ وان فاتح کو کرسی پیش نہیں کرتے۔"

"میں... ان سے... نہیں ڈرتا۔" وہ بے بسی بھرے غصے سے مٹھیاں بھینچ کے بولا۔ تالیہ نے پھر شانے اچکائے۔

"مگر آپ روسا اور امراء سے ڈرتے ہیں جو ابھی اپنے غلاموں کی خبر لینے یہاں پہنچ جائیں گے۔ سب پوچھیں گے کہ آخر وان فاتح کون ہے؟ سلطان تک بھی خبر جائے گی۔ وہ بھی شک میں پڑ جائے گا کہ اس غلام کو قید کیوں کیا گیا تھا آخر؟ کیا جواب دیں گے سب کو؟ یہی کہ اس نے شہزادی تاشہ سے نکاح کر لیا تھا اس لیے؟"

"تم!" مارے ضبط کے مراد نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"وقت کم ہے بابا! اور وقت ہی سارے مسئلوں کا حل ہے۔ وان فاتح کو کرسی پیش کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔" پھر بازو سینے سے ہٹائے اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔ "راجہ!" اور مسکرا کے مڑ گئی۔

مراد راجہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

کھڑکی تلے دور نیچے بیٹھے غلاموں کے ہجوم کی خاموشی اس کے کانوں میں صور کی صورت گونج رہی تھی۔

☆☆☆

ملاکہ کی بندرگاہ پہ سرخ جھنڈے والا بحری جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا۔ سمندر دوپہر کے اس وقت پر سکون لگتا تھا۔ پانی دھوپ میں چمک رہا تھا اور بندرگاہ پہ روانہ ہوتے قافلوں کا شور معمول کے مطابق تھا۔

ایسے میں چینی بحری جہاز کے عرشے کے اوپر ایڈم بن محمد کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے' وہ گردن اٹھائے دور تک پھیلا ملاکہ شہر دیکھ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔

اس کے سپاہی عقب میں مستعد سے کھڑے تھے۔ جب وہ ان کو اشارہ کرے گا تو وہ 'اپنے' صندوق نیچے اتاریں گے' مگر ایڈم کو پہلے خود ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ اس کی کھوجتی نگاہیں ایک سے دوسرے سے ہوتیں ہجوم میں الجھی تھیں اور تب ہی وہ اسے نظر آ گئی۔

سادہ بھورے رنگ کی باجو کرنگ میں ملبوس' وہ سر پہ مفلر کی طرح دوپٹا لپیٹے' مسکراتی ہوئی بحری جہاز کے زینے چڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ایڈم بھی مسکرایا۔ اپنی راج دھانی میں ہونے کے باوجود وہ آج سادہ نظر آ رہی تھی۔

ایڈم نے پل بھر کو پلکیں موندیں اور سات دن پہلے کی وہ دوپہر یاد کی جب وہ تینوں جیا کی بالائی منزل کے ہال نما کمرے میں ملے تھے۔ کونے کی میز کے گرد بیٹھے انہوں نے سارا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

"تم دونوں تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈو گے اور اس کی طرف جاؤ گے۔ تالیہ.... تم اپنے بہترین اور وفادار سپاہی ساتھ لے کر جاؤ جن کے خاندان تمہارے پاس محل میں ہوں گے تاکہ وہ خزانہ دیکھ کے تمہیں مارنے کے بجائے بحفاظت واپس لانے پہ مجبور رہیں۔" سفید کرتے پاجامے میں ملبوس وان فاتح سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ درمیان میں نقشہ پھیلا رکھا تھا۔

"جزیرے پہ کچھ تو ہمارا منتظر ہوگا۔" ایڈم کو تشویش ہوئی۔

"جو بھی ہو' تم اس سے لڑنا اور خزانے کو نکال لانا۔ ایڈم کشتی پہ واپس آ جائے گا اور تالیہ وہیں رہے گی۔ جہاز چین سے روانہ ہو چکا ہے' وہاں پہنچنے میں چند دن لگیں گے۔ تمہیں صبر سے اس کا انتظار کرنا ہے۔"

"پلان سی!" تالیہ نے کسی شاگرد کی طرح ہاتھ اٹھا کے اجازت مانگی تو دونوں اسے دیکھنے لگے۔

"اگر وہاں جا کے مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں ایڈم کو چھوڑ کے واپس آ جاؤں گی۔"

"مجھے پہلے ہی آپ سے یہی امید تھی کہ آپ مجھے چھوڑ کے آنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔" ایڈم خفا ہوا تو تالیہ نے اسے گھورا۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جلد یا بدیر راجہ کو وان فاتح کا علم ہو جائے گا۔ ملکہ بھی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں میرا یہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایک دفعہ خزانہ مل جائے تو تمہیں میری ضرورت نہیں ہوگی۔"

"میں اکیلا کیسے.....؟"

"ایڈم!" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ "کب تک تم لیڈ ہوتے رہو گے؟ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے فیصلے خود کرو اور بڑی بڑی مہمات پہ نکلنا خود سیکھو۔"

ایڈم نے بس ایک خفا نظر تالیہ پہ ڈالی اور پھر فاتح کو دیکھا۔

"اور اگر ملکہ نے جہاز نہ بھیجا تو؟"

"ایڈم ٹھیک کہہ رہا ہے' تو انکو۔ کیا ہمیں اس بات پہ یقین کر لینا چاہیے کہ ملکہ ہماری مدد کرے گی؟"

"بالکل نہیں کرنا چاہیے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ملکہ کا ہم سے کیا رشتہ ہے جو وہ ہماری مدد کرے گی۔" وہ دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے تو وہ توقف سے بولا۔

"مگر ہمیں اتنا یقین ہے کہ ملکہ مراد راجہ کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں گنوائے گی۔ ملکہ ہماری بھی دشمن ہے مگر ہمیں اس کے اوپر اپنے اعتبار کو نہیں ماپنا۔ ہم نے اس کی مراد راجہ سے نفرت کو ناپ کے فیصلے کرنے ہیں۔"

"دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ میں سمجھ گئی۔" تالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ملکہ ضرور جہاز بھیجے گی اور ہم سارا سونا لے بھی آئیں گے۔ اس کے بعد؟"

"امید ہے تب تک مراد سے میرا تعارف ہو چکا ہوگا۔ اس وقت تک اس کی ساری طاقت ختم ہو چکی ہوگی۔ میں اس کو مجبور کروں گا کہ وہ ہمیں واپس جانے دے۔"

"اور وہ سونا۔" ایڈم فوراً بولا تو تالیہ نے اسے دیکھا۔

"سونا ملاکہ کے لوگوں کی ملکیت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں وہ شہر کے سارے غریب لوگوں میں بلا تفریق بانٹ دینا چاہیے تاکہ وہ اس سے اپنی زندگیاں سنوار سکیں۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا تو انکو؟"

"سونا ملاکہ کے لوگوں کا ہے اور اس کا فائدہ لوگوں کو ہی ملنا چاہیے۔" اس نے رسان سے کہا تو تالیہ مسکرادی۔ ایڈم کو بھی سن کے بھلا معلوم ہوا۔

"لیکن سر....." پھر اسے خیال گزرا۔ "آپ راجہ کو کیسے مجبور کریں گے کہ وہ ہمیں واپس جانے دیں۔"

"جس دن تم جہاز لے کر واپس آؤ گے' تم خود جان لو گے۔" اس نے بھی مسکرا کے تسلی دی۔ اور جیا کی وہ اسرار بھری فضا میں ڈوبی دوپہر دھندلی ہوتی گئی۔

"امانت واپس لے آئے؟" تالیہ کی بات پہ چونکا۔ وہ اب عرشے تک آ چکی تھی۔ ایڈم سنبھل کے مسکرایا۔ وہ بحری جہاز کے عرشے پہ کھڑا تھا اور تالیہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ رہی تھی۔

"آپ تو شاید میرا تابوت دیکھنے کی دعا کر رہی تھیں۔"

"اگر تمہارے لیے میری دعائیں پوری ہوتیں تو آج تمہارے جنازے کو چار ماہ بیت چکے ہوتے۔" وہ اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ عرشے کے کناروں پہ لوہے کی ریلنگ لگی تھی۔ تالیہ نے اسے تھام لیا اور سمندر کے پانی کو دیکھنے لگی۔

"حالات کیسے ہیں؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جیسے ہم نے سوچے تھے۔ اب بہت جلد مراد راجہ گھٹنے ٹیک دے گا۔"

"شکر اور یہ سارا سونا ہم ملاکہ کے غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ مجھے یہ سب کر کے بالکل رابن ہڈ والی فیلنگ آ رہی ہے۔ وہ بھی اسی طرح خوش ہوتا ہوگا۔"

تالیہ ہنس دی۔ "رابن ہڈ ایک چور تھا۔"

"مگر وہ غریبوں میں اپنی چوری بانٹ دیتا تھا۔ چور چور میں فرق ہوتا ہے۔"

وہ دونوں عرشے کی ریلنگ کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے اور نیچے ایک طرف سمندر پھیلا تھا' دوسری طرف ساحل پہ کشتیوں' ملاحوں اور مسافروں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ وہ جواب میں پھر سے ہنسی تو ایڈم بولا۔

"آپ رابن ہڈ کو چھوڑیں' اپنے وان فاتح کی سنائیں۔ آپ کی ضرورت پڑی ان کو یا نہیں؟"

تالیہ نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "شہزادی جیسی تاشہ نے ایک غلام سے شادی کی تھی اور اسے آزاد کر دیا تھا۔ سو میں نے بھی انہیں آزاد کروا ہی دیا۔ تقریباً۔" پھر چونکی۔ "تاشہ کی نظم!" کچھ یاد آیا۔ "وہ تو میں نے لکھی ہی نہیں۔"

"وہ جو آپ نے خواب میں سن باؤ کے گھر لکھی دیکھی تھی۔"

"ہاں وہی۔ وہ تو مجھے ابھی لکھنا تھی۔"

"تو جا کے لکھ لیں۔"

تالیہ نے پھر گومگوں کیفیت سے اسے دیکھا۔

"مگر ضروری تو نہیں کہ وہ نظم میں نے ہی لکھی ہو اور کیا ضرورت ہے مجھے اسے لکھنے کی۔"

"درست کہا۔ جو تاریخ میں ہو چکا ہے' وہ کسی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ زبردستی حالات کا رخ نہیں موڑ سکتیں۔" پھر وہ ساحل کی طرف دیکھنے لگا جہاں چینی فوجیوں کا قافلہ آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ہمراہ گھوڑا گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ ایڈم نے گہری

سانس لی۔

''آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔'' تالیہ نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

ایڈم اب سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے بہت سی ہدایات جاری کرنا تھیں۔

☆☆☆

عصر کا وقت ہوا تو بندا ہارا کے محل پہ ٹھنڈی چھایا اتر آئی۔ دیوان خانے کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور اندر ایک میز کے گرد دو کرسیاں رکھی دکھائی دیتی تھیں۔ دونوں خالی تھیں۔

مراد راجہ دیوار سے ٹیک لگائے' ہاتھ میں ننھا سا حقہ تھامے کھڑا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ حقے کی نال لبوں میں دباتا اور گڑگڑاہٹ سے تمباکو اندر کھینچتا۔ پھر نال ہٹا کے منہ سے دھواں باہر نکالتا۔ دھوئیں کے مرغولے فضا میں تیرنے لگتے۔ وہ بظاہر پرسکون لگتا تھا مگر کبھی کبھی چہرے پہ اضطراب دکھائی دینے لگتا جسے وہ مسلسل چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور دو سپاہی وان فاتح کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔ اس نے اب پاجامے پہ خاکی کرتا پہن رکھا تھا۔ جس کی لمبی آستینیں تھیں اور ہاتھ کی پٹیاں نظر آتی تھیں۔ کنپٹی کے زخم اور سر کے زخم پہ لیپ شدہ دوا سوکھ چکی تھی۔ کوئی زنجیر نہیں' کوئی ہتھکڑی نہیں۔

اس کے چہرے کے تاثرات ہموار تھے۔ پرسکون۔ ٹھنڈے۔ سپاہی چلے گئے تو اس نے بس نگاہیں گھما کے اس خالی خالی سے کمرے کو دیکھا' پھر نظر کرسی میز پہ ٹھہری۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

''ہماری دنیا میں جب کوئی مذاکرات کرنے پہ راضی ہو جائے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں میز پہ آمنے سامنے بیٹھنے کو تیار ہیں۔''

وہ محظوظ سا بولا۔ مراد راجہ نے کھڑکی سے ٹیک لگائے' شکاری نظریں اس پہ جمائے' حقے کا کش لیا اور حقہ کھڑکی کی منڈیر پہ رکھا۔ پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔

''کرسی حاضر ہے۔ تم بیٹھو۔''

فاتح نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پیشکش قبول کی اور کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ پھر ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

''تم بھی بیٹھو راجہ۔''

''تمہارے بیٹھنے کی بات ہوئی تھی' میرے نہیں۔'' وہ وہیں ٹیک لگائے کھڑا رہا۔

''اوہ۔ تم مجھے اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ خیر۔'' اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ اس کی چھوٹی خوب صورت آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

''اس ہجوم کے بارے میں تو سن لیا ہو گا تم نے۔'' مراد راجہ نے کھڑکی سے نیچے نظر آتے لوگوں کی طرف اشارہ کیا تو کرسی پہ بیٹھے فاتح نے سر کو خم دیا۔

''میں ایک عرصہ ان لوگوں کو ان کے اپنے لیے کھڑا ہونے کی ترغیب دیتا رہا' مگر کمزور لوگ شاید اپنے لیے کھڑے نہ بھی ہوں تو اس کے لیے ضرور ہو جاتے ہیں جس سے وہ محبت کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کم از کم یہ لوگ کھڑے تو ہوئے۔''

مراد نے حقہ اٹھایا اور غور سے دور بیٹھے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ان لوگوں کو یہاں سے بھیجنے کا کیا لو گے؟''

''یقیناً ان کے مالک تمہیں تنگ کر رہے ہوں گے۔ جلد سلطان کو خبر ملنے والی ہو گی لیکن یہ لوگ تمہارا مسئلہ نہیں ہیں۔ تمہارا مسئلہ آج دوپہر ملاکہ کی بندرگاہ پہ لنگر انداز ہوا ہے۔''

مراد چونکا۔ ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ''کیا مطلب؟''

''ہم نے تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈ لیا ہے اور تمہارا پالتو وحشی درندہ مار کے تمہارا خزانہ بحفاظت ملاکہ لے آئے ہیں۔''

مراد لمحے بھر کو ششدر رہ گیا۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔

''وہ خزانہ چینی بحری جہاز پہ آیا ہے اور اسے چینی سفارت خانے بھیجا گیا ہے۔ بظاہر وہ چین سے آئے قرضے کے سکوں سے بھرے صندوق ہیں لیکن ان میں اکیس صندوق تمہارے ہیں۔''

مراد ایک دم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا' مگر پھر رک گیا۔

''یہی سوچ کے رکے ہو نا کہ چینی سفارت خانے پہ حملہ نہیں کروا سکتے تم! میں نے بھی یہی سوچ کے چینی جہاز میں سامان لانے کو کہا تھا۔ بالفرض تم چینی سفارت خانے پہ حملہ کروا بھی دو تو اپنی فوج اور سلطان کو کیا وجہ بتاؤ گے؟ تم خزانے کی حقیقت کھولنے کے متحمل نہیں ہو۔''

مراد کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ کمرے کے وسط میں مجسمے کی طرح کھڑا فاتح کو دیکھنے لگا' اس حالت میں کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

''یان سوفو! وہ تمہارے ساتھ شریک تھی۔ ہے نا!'' اس کی سمجھ میں سارا کھیل آنے لگا۔

''آگے کا سوچو راجہ۔ اگر تم ہر خطرہ مول لے کر چینی سفارت خانے پہ حملہ کر بھی دو تو جانتے ہو سفارت کاروں کو مارنا کتنا سنگین جرم ہے؟ وہ بھی اس دور میں جب کہ تمہاری ملکہ چینی ہے؟ نہیں مراد راجہ! تم چین سے جنگ چھیڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگیں مگر آواز میں نہ کوئی غراہٹ تھی' نہ گرج۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرک چکی تھی۔

''تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شہزادی تاشہ جنوبی محل نہیں گئی تھی۔ وہ جزیرے پہ گئی تھی اور ملاکہ کے لوگوں کی امانت واپس لے آئی ہے۔''

چند لمحے کمرے میں ہولناک خاموشی چھائی رہی۔ مراد راجہ بت بنا کھڑا بے یقینی اور غیظ و غضب سے اسے دیکھے گیا جو مطمئن سا کرسی پہ بیٹھا تھا۔

''تم...... کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں چند راستے دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے سفارت خانے پہ حملہ کروایا تو سلطان کو ناراض کر دو گے اور چین سے جنگ چھڑ جائے گی۔ اگر تم نے ان لوگوں کو محل کے سامنے سے نہ ہٹایا تو سلطان کو علم ہو جائے گا کہ تم نے کسی غلام کو قید کر رکھا ہے۔ بات کھلے گی اور میرے اور تالیہ کے نکاح کے بارے میں سب کو علم ہو جائے گا۔ اس نکاح کے گواہ بھی ہیں اور ثبوت بھی۔ اس کے بعد سلطان تمہیں جان سے مارنے کا حکم بھی دے سکتا ہے اور اگر اس سب سے پہلے تم نے مجھے مار دیا تو نہ صرف تمہاری بیٹی تم سے نفرت کرنے لگے گی بلکہ تمہارے پاس خزانے کے بارے میں مذاکرات کرنے کے لیے کوئی نہیں بچے گا۔''

''تم...... کیا چاہتے ہو؟''

''میں جانتا ہوں اب تک تم نے سلطان سے بغاوت کرنے کا سوچ لیا ہو گا۔ اپنی خفیہ فوجیں بھی تیار کر رکھی ہوں گی کیونکہ تم جانتے ہو اب تالیہ اور سلطان کی شادی ممکن نہیں ہے۔ تمہیں اس وقت 'خطرے' کو سامنے سے ہٹانا ہے اور میں سب سے بڑا خطرہ ہوں۔ اصولاً تمہیں میری جان لے لینی چاہیے مگر یہ ناممکن ہے اس لیے تم ایک کام کرو۔''

''تمہیں چابی دے دوں تا کہ تم واپس چلے جاؤ؟'' وہ طنز سے بولا۔

''صرف میں نہیں۔ تالیہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔ جب ہم دونوں غائب ہو جائیں گے تو تم سلطان کو کوئی بھی وجہ بتا کے ٹال سکتے ہو۔ ملکہ نکاح والی بات دہرا بھی دے تو تم کہہ سکتے ہو کہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ دونوں منکوح تو ملاکہ سے جا چکے ہوں گے۔ تالیہ چلی جائے تو ملکہ بھی مزید اس معاملے کو نہیں کریدے گی۔ تم بندا ہارا رہو گے اور حکومت کرو گے۔ ہاں اگر ہمارے جاتے ہی سلطان تمہارے خلاف ہو گیا تو تم بغاوت کر کے تخت پہ قبضہ کر سکتے ہو۔ اس سارے مسئلے کا حل ہم دونوں کے یہاں سے چلے جانے میں ہے۔'' وہ روانی سے بتا رہا تھا۔

مراد کے وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ قدم قدم چلتا فاتح کے سامنے آیا اور مقابل رکھی خالی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھے جھکا۔

''تالیہ...... میری بیٹی ہے۔ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔''

''وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اسے جلد

یا بدیر یہ دنیا چھوڑ کے جانا ہی ہے اور ہمارے یہ مذاکرات تب ہی کامیاب ہوں گے جب تم تالیہ کو میرے ساتھ بھیجو گے۔"

مراد خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتا، ضبط سے گہرے سانس لیتا رہا۔

"اور خزانہ؟ اس کو غریبوں میں بانٹ دو گے کیا؟" انداز میں تحقیر اور استہزاء تھا۔

"تالیہ یہی چاہتی ہے کہ اسے غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔" وہ ٹھہرا۔

مراد مزید اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مگر تم تالیہ نہیں ہو۔ تم لامتناہی کھیل کھیلنے والے آدمی ہو اور تمہارے کھیل میں حدود و قیود اپنی مرضی سے بدلی جا سکتی ہیں۔ تم بتاؤ، خزانے کا کیا کرنا چاہتے ہو؟"

کرسی پہ بیٹھا وان فاتح بن رامزل مسکرایا۔

"ہاں میں تالیہ نہیں ہوں۔ اس لیے میں اور تم خزانے کے بارے میں ایک معاہدہ کر سکتے ہیں۔"

مراد کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

"تم بالکل میرے جیسے ہو۔ وہی طاقت کی ہوس، وہی اپنی ذات کی پرستش۔"

"مراد راجہ!" اس نے مراد کی بات نظر انداز کی۔ "میں تمہارا سارا خزانہ واپس کر سکتا ہوں اگر تم ملاکہ کے تمام ناجائز غلاموں کو آزادی دلوا دو۔"

مراد کے ابرو تن گئے۔ "وہ کیسے؟"

"تم ملک میں قانون بنا دو کہ صرف غیر مسلم جنگی قیدی کو غلام بنایا جا سکے گا۔ ساری دنیا میں اسلام کا یہی اصول ہے۔ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جاتا۔ اس وقت ملاکہ کے چند بڑے رئیسوں کے پاس بہت سے ایسے غلام ہیں جو مسلمان ہیں اور اغوا کر کے جبراً ان کو غلام بنایا گیا ہے۔ اب تم ان کے مالکوں کو ان کی قیمت ادا کرو یا ان کو ڈراؤ دھمکاؤ، جس وقت وہ غلام آزاد ہو جائیں گے میں تمہارا خزانہ واپس کر دوں گا۔ ملاکہ کے لوگوں کی دولت لوگوں کے ہی کام آنی چاہیے۔"

"اور پھر میں تمہیں چابی دے دوں اور تمہیں یہاں سے جانے دوں؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں۔ ورنہ سلطان کو اس نکاح کی خبر ہو جائے گی اور تمہاری مشکلات بڑھ جائیں گی۔ لیکن اگر تم میری بات مان لو تو تم بدستور حکمرانی کرتے رہو گے اور مزید جزیروں پہ اپنا مال چھپاتے رہو گے۔ میں تمہیں بدعنوانی کرنے اور لوگوں کا مال لوٹنے سے نہیں روک سکتا، لیکن میں اپنی اور تالیہ کی بقا کا راستہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔"

چند لمحے وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، جیسے ذہن میں جمع تفریق کر رہا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں چابی دے دوں گا۔ لیکن تالیہ کو مت لے کر جاؤ۔ وہ گئی تو واپس نہیں آئے گی۔"

"تم نے اسے خود اپنے اعمال سے کھویا ہے۔ وہ تمہارے کردار سے نفرت کرتی ہے۔ تمہاری طاقت کی ہوس، تمہاری چالبازیاں....." پھر سر جھٹکا۔ "خیر! ان کے بغیر ہمارا کوئی معاہدہ مکمل نہیں ہو گا۔"

مراد نے گہرا ہنکارا بھرا۔ "مجھے سوچنے دو۔"

"وقت کم ہے، مراد۔ اور یہ سارے کھیل وقت کے ہی ہیں۔"

"کچھ دیر..... مجھے کچھ دیر سوچنے دو۔" اس نے بے بسی بھری ناگواری سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا۔ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے وہ زمین پہ بدھا کے انداز میں آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور سرخ پٹی اتار پھینکی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ساری آوازوں اور سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ دماغ کو ایک نکتے پہ مرکوز کیا۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور لب بڑبڑا رہے تھے۔

"میں مراد راجہ ہوں۔ ملاکہ سلطنت کا بنداہارا۔ مجھے کوئی ایسے نہیں ہرا سکتا۔ کوئی مجھ سے میرا تخت اور میری بیٹی نہیں چھین سکتا۔"

مغرب ڈھل گئی اور باہر بیٹھے لوگ اسی طرح بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ ان کو بلانے کے لیے آنے والے ان کے مالکوں کے وفادار غلام بھی گھوڑوں پہ آئے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے بہت پکارا، غصہ کیا، آوازیں دیں، مگر وہ غلام ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ بس محل کی اونچی کھڑکیوں کو دیکھتے رہے اور لبوں پہ چپ کی مہر لگی رہی۔

وان فاتح کرسی پہ بیٹھا کھڑکی کے باہر آسمان پہ چھاتی سیاہی دیکھ رہا تھا۔ کافی وقت بیت چکا تھا اور مراد واپس نہیں آیا تھا۔

اسے ذرا فکر ہوئی مگر اس نے اعصاب کو پرسکون رکھا۔

مغرب اُتر آئی تو دروازہ کھلا اور مراد اندر داخل ہوا۔ آتے کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کیا اور کھڑکیوں کے آگے پردے جھٹک کے برابر کیے۔ پھر فاتح کے سامنے آیا۔ سرخ پٹی ماتھے سے غائب تھی اور ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس نے بوتل میز پہ رکھی تو فاتح نے دیکھا۔ اس کے پیندے میں سکہ اور ڈلی پڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چابی۔

مراد کا چہرہ وہ نہیں تھا جو پہلے تھا۔ وہ پرسکون نظر آتا تھا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ پھر اس نے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔ دونوں ہاتھ میز پہ جما کے اس کی طرف جھکا۔

"میں تمہاری دنیا کے باسیوں کی طرح میز پہ آنے کو تیار ہوں۔"

وان فاتح نہیں مسکرایا۔ کچھ عجیب سا تھا، مراد راجہ کی مسکان میں جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے؟" وہ بظاہر ٹھنڈا رہا۔

"میں نے ابوالخیر اور تمام روسا کو پیغام بھیج دیا ہے۔ چند ساعتیں پہلے انہوں نے تمام ناجائز غلام آزاد کر دیے ہیں۔ حکم نامے تحریری طور پہ تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔"

"تم نے ان کو رقم ادا کی؟"

"میں ان کا بنداہارا ہوں۔ میرے احسان ہیں ان پہ۔ اور تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ناجائز غلام آزاد ہیں۔ وہ کل صبح سے اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"مجھے تمہاری بات پہ یقین ہے۔"

"اس کے علاوہ یہ رہی چابی۔ تم مجھے سونا واپس کر دو اور اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ تالیہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے۔"

"کیا واقعی!" اس نے آنکھیں سکیڑ کے بنداہارا کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں۔ سونا میرے پاس آ جائے گا۔ میں نے جان لیا ہے کہ میں تالیہ کو زبردستی یہاں نہیں رکھ سکتا۔ وہ بھی آزاد ہے۔ تم دونوں جا سکتے ہو۔"

"اور ابھی تم "مگر" کہنے والے ہو، ہے نا راجہ!" وہ غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

مراد راجہ مسکرایا۔ "مگر......" زور دے کے بولا۔ "مگر میری ایک شرط ہے۔"

فاتح نے گہری سانس لی۔ "شرط ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ میں کروں گا۔"

"نہ ماننے کی صورت میں، میں بغاوت کر دوں گا، جب چینی ملکہ ملک بدر ہو جائے گی تو چینی سفارت خانے کا ڈر کس کو ہو گا۔ تم میرے قیدی رہو گے۔ تالیہ مجبوراً یہاں رہے گی پھر سونا اور تخت میرا ہو گا۔"

"راجہ تم اتنا خون خرابہ نہیں کرانا چاہتے، میں جانتا ہوں۔"

"میں یہ کر سکتا ہوں مگر واقعی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم میری شرط مان لو اور یہ چابی اٹھا کے یہاں سے چلے جاؤ۔" مراد کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی اور شکاری آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

"کیا شرط ہے تمہاری؟" اس کے اعصاب تن رہے تھے۔ کچھ بہت عجیب سا تھا اس ماحول میں۔

راجہ نے حقہ اٹھا کے کش بھرا۔ پھر نال ہٹائی اور دھوئیں کا مرغولہ لبوں سے چھوڑا۔ مرغولے فضا میں اوپر کو اٹھتے گئے۔

تمباکو کی خوشبو اور سلگتے انگاروں کی مہک آپس میں گھل مل گئی۔

پھر مراد راجہ نے کہنا شروع کیا۔

☆☆☆

چینی سفارت خانے کے نام پہ بنی حویلیاں سن باؤ کی حویلی کے دائیں بائیں واقع تھیں۔ آج وہاں بھاری چینی فوج تعینات تھی۔ اکثریت ان چینی افسران کی تھی جو ملکہ یان سوفو کی شادی کے وقت ساتھ آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔

سونے سے بھرے صندوق اندر رکھوائے جا چکے تھے اور سن باؤ کے سرخ دروازے کے باہر ایڈم اور تالیہ متفکر سے کھڑے تھے۔ ابھی ابھی ایک چینی سفارت کار نے آ کے اطلاع دی تھی کہ بنداہارا کی حویلی کے سامنے اکٹھے ہوئے غلام وہاں سے اٹھ گئے ہیں۔

''کیا وہ تھک گئے تھے؟'' ایڈم نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں۔ راجہ نے اس قیدی فاتح کو باہر بھیجا اور اس نے ان کو اٹھنے کے لیے کہہ دیا۔ مگر وہ غلام اپنے مالکوں کے پاس نہیں گئے۔ راجہ نے نیا قانون نافذ کر دیا ہے۔ جس کے تحت ناجائز مسلمان غلام آزاد ہیں۔ اب وہ غلام ملاکہ کی گلیوں میں خوشیاں مناتے پھر رہے ہیں اور ان کی زبان پہ ایک ہی نعرہ ہے کہ شہزادی تاشہ کی سفارش پہ ان کو آزاد کروایا گیا ہے۔''

سفارت کار یہ کہہ کے وہاں سے ہٹ گیا تو تالیہ نے گہری سانس لی۔

''یعنی وان فاتح نے غلاموں کو آزاد کروا دیا۔ مگر تم اپنی کتاب میں لکھنا کہ یہ سب شہزادی تاشہ نے کروایا ہے۔''

''جی میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ جہاں اتنے جھوٹ بولے وہاں ایک اور سہی۔''

''اور یہ بھی لکھنا کہ......''

''شہزادی صاحبہ اب دیر ہو چکی ہے۔ میں اپنی کتاب مکمل کر کے شاہی کتب خانے کے منتظم کو دے آیا ہوں۔ اب اس میں ایک ہی صورت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ دونوں مجھے ملاکہ میں چھوڑ جائیں۔'' وہ جل کے بولا تھا۔

چند ساعتیں گزریں تو تالیہ نے فکرمندی سے سڑک کو دیکھا جو اندھیری پڑی تھی۔

''وان فاتح کہاں رہ گئے؟ ان کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں راجہ سے مذاکرات کامیاب ہوئے یا نہیں۔''

اس کی بات منہ میں رہ گئی۔ دور افق سے دھول اڑتی دکھائی دی تھی۔ وہ چونکی۔

آس پاس تعینات چینی سپاہی بھی چوکنے ہوئے۔

سڑک پہ تیز گھوڑے دوڑتے آ رہے تھے۔ گھوڑا گاڑیوں کے پہیوں کی آواز.... چینی سپاہیوں نے تلواریں نکال لیں۔

قافلہ قریب آیا اور چاند کی روشنی میں نظر آیا..... مراد راجہ سب سے آگے والے گھوڑے پہ تھا اور دوسرے گھوڑے پہ فاتح بیٹھا تھا۔

تالیہ اور ایڈم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' سن باؤ ساتھ آ کھڑا ہوا اور پریشانی سے بولا۔ ہاتھ نیام کی تلوار پہ تھا۔

''وانگ لی''۔ گھوڑے پہ بیٹھے فاتح نے ہاتھ اٹھا کے ان کو تھم جانے کا اشارہ کیا' اور اپنا گھوڑا قریب لایا' پھر نیچے اترا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے شاکی نظروں سے مراد راجہ کو دیکھا۔ اس نے ماتھے پہ سرخ پٹی باندھ رکھی تھی اور لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ وہ بھی تالیہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے نظریں پھیر لیں۔

''وانگ لی۔'' فاتح نے ان دونوں کو نظرانداز کر کے سن باؤ کو مخاطب کیا۔ ''مراد راجہ کے ایکس صندوق اس کے حوالے کر دو۔''

ایڈم کا منہ کھل گیا۔

تالیہ شل رہ گئی۔

سن باؤ بھی چونکا۔ ''مگر....''

''یہ میرا فیصلہ ہے اور تم سب کو ماننا ہو گا۔'' وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔

''مگر وہ تو غرباء کے لیے.....'' تالیہ نے بولنا چاہا تو فاتح نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کرا لیا۔

''اس کے بدلے میں تمام غلام آزاد ہو گئے ہیں۔ سونے کے چند سکے ہر شخص کے حصے میں آئیں' اس سے بہتر یہ نہیں کہ انہیں آزادی مل جائے؟ میں نے جو کیا ہے وہ ملاکہ کے لوگوں کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ میں نے غلاموں سے آزادی اور تم دونوں سے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔ کسی کی غربت مٹانے کا نہیں۔ اس لیے مجھے میرے وعدے نبھانے دو۔''

کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدل گیا تھا۔ سختی' سنجیدگی۔ کوئی سایہ سا تھا جو چہرے پہ آن پڑا تھا۔

ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا' البتہ تالیہ نے سر ہلا دیا۔ ''جو آپ کو مناسب لگے' تو انکو!''

''مگر...... ملکہ نے تو......'' سن باؤ نے سرگوشی میں احتجاجاً فاتح سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔

''میں ملکہ کا غلام نہیں ہوں۔ سلطان کو دوسری ملکہ نہیں لانے دوں گا۔ یہ وعدہ کیا تھا میں نے۔ مراد راجہ کو تباہ کرنے کا نہیں۔ اس لیے.... راجہ کے صندوق واپس کر دو۔''

غلام حکم دے رہا تھا۔ پٹی بندھا ہاتھ اٹھا کے اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ سن باؤ نے گہری سانس لی اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

کچھ بعید نہیں یہ غلام سلطان کو جا کے کہہ دے کہ اس سازش میں ملکہ بھی شریک تھی۔ ایسی صورت میں سارا کھیل پلٹ جاتا۔

مراد کے ساتھ آئے سپاہی ان حویلیوں کی طرف چلے گئے۔ سن باؤ بھی ساتھ ہو لیا۔ البتہ بار بار ناخوشی سے پلٹ کے ان کو دیکھتا ضرور تھا۔

ایڈم گم صم کھڑا تھا۔ تالیہ خاموش تھی۔ فاتح حویلیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اور گھوڑے پہ بیٹھا راجہ ان تینوں کو۔

''تو یہ شاہی مورخ بھی تمہارے ساتھ آیا تھا؟'' اس نے براہ راست تالیہ کو مخاطب کیا تو اس نے خفا سی نظریں اٹھائیں۔

''ہمارا آنا آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم لیے جائیں گے' کیوں نہ اس بارے میں بات کر لی جائے۔'' وہ برہمی سے بولی تو فاتح نے اس کو دیکھا۔

''راجہ نے مجھے چابی دے دی ہے۔'' ساتھ ہی کرتے کے گریبان کے اندر سے سنہری زنجیر نکال کے دکھائی جس میں ڈلی اور سکہ دونوں کو جوڑ کے بنی چابی پروئی تھی۔

تالیہ نے چونک کے باپ کو دیکھا جو دھیما سا مسکرا رہا تھا۔

''تم جاؤ تالیہ! یہ چابی تمہیں خود راستہ دکھا دے گی۔ تمہیں اسی جنگل میں جانا ہے جہاں سے تم آئے تھے۔''

''ہم تینوں.... جا سکتے ہیں؟'' وہ حیران تھی۔ بار بار فاتح کو دیکھتی۔ جیسے ابھی وہ کوئی ''مگر'' کہے گا لیکن وہ سنجیدہ رہا۔

''مراد راجہ درست کہہ رہا ہے۔ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سونا لینا اور سلطان سے بات کرنا' یہ سب مراد راجہ کا کام ہے۔ کیا تمہیں محل سے کچھ اٹھانا ہے؟'' عام سے انداز میں رک کے تالیہ کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں بنداہارا کے اونچے محل پہ۔'' تنفر سے بولی تو فاتح نے سر ہلا دیا۔

''پھر آؤ۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈم کو بھی اشارہ کیا تو وہ بھی گم صم سا ساتھ ہو لیا۔

ذرا فاصلے پہ فاتح کے گھوڑے کے ساتھ دو مزید تازہ دم گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ان پہ کھانے پینے کا مناسب سامان بھی لدا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پہ

سوار ہو رہا تھا جب ایڈم پیچھے سے شاکی انداز میں بولا۔

"تو آپ نے وہی کیا جو سیاست دان کرتے ہیں۔ آپ نے ڈیل کر لی۔" وہ ابھی تک سُن تھا۔

وان فاتح رکاب پہ پیر رکھ کے اوپر چڑھا اور گھوڑے کی لگام تھامے سرسری سا ایڈم کو دیکھا۔

"میں نے اس سے زیادہ کا وعدہ نہیں کیا تھا۔" اور پھر دل میں سوچا۔

(تم کیا جانو میں نے کیا قربان کیا ہے۔)

"مگر ہمیں ملاکہ کے لوگوں کے سامنے راجہ کی بدعنوانی کا پول کھولنا تھا۔ ہمیں....."

"ہمیں صرف واپس جانا تھا' ایڈم۔ ہمیں اپنی اصل زندگیاں واپس چاہیے تھیں۔ اس دنیا میں ہمارا کوئی ہدف نہیں تھا۔ ہم لامتناہی کھلاڑی تھے۔ بس۔ اس لیے خوش ہونا سیکھو۔ تم واپس جا رہے ہو۔" وہ رعب سے بولا تو ایڈم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ فاتح اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

ادھر مراد گھوڑے سے اترا اور تالیہ کے سامنے آیا۔ وہ ہنوز سلوٹ زدہ پیشانی لیے کھڑی تھی۔ چہرے پہ خفگی اور الجھن تھی۔

"تم نے اس غلام سے نکاح کر کے میرے پاس کوئی راستہ نہیں چھوڑا' تالیہ۔" وہ اس کے سامنے کھڑا املال سے کہہ رہا تھا۔

"آپ اپنے ہی لوگوں سے دھوکا کرنے والے ایک بدعنوان آدمی ہیں' بابا۔ آپ نے مجھے محل میں قید کر رکھا تھا۔ آپ کی چابی نے مجھ سے میری دنیا چھین لی۔ مجھے ابھی بھی آپ پہ شک ہے۔"

"کیا شک ہے؟" وہ پرسکون سا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"یہی کہ آپ مجھے کسی طرح اس دنیا میں روکنے کی کوشش کریں گے۔"

"نہیں۔ میں تمہیں اپنی مرضی سے جانے دے رہا ہوں کیونکہ....." وہ آگے بڑھا' اس کے کندھوں کو نرمی سے تھاما اور اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔

"کیونکہ مجھے یقین ہے' تم واپس ضرور آؤ گی۔"

تالیہ نے زور سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ اسے مراد راجہ پہ بری طرح غصہ آیا تھا۔

"تالیہ واپس کبھی نہیں آئے گی۔ مجھے آپ کا محل' آپ کی دولت اور آپ کی طاقت نہیں چاہیے۔ مجھے اپنی عام سی دنیا واپس چاہیے۔ میں اسی میں خوش تھی' بابا۔"

اور اس کے پاس سے گزر کے آگے نکل گئی۔

اس کا گھوڑا تیار تھا۔ ایڈم اور فاتح گھوڑوں پہ بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ تالیہ اپنے گھوڑے پہ چڑھی اور تیزی سے اس کا رخ موڑ دیا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا' تالیہ۔" عقب میں کھڑا مراد کمر پہ ہاتھ باندھے' پرسکون سا گردن اٹھائے ان تینوں کو اندھیری سڑک پہ آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے مڑ کے دیکھا تک نہیں۔

مڑ کے دیکھنے والے نمک کے مجسمے بن جاتے ہیں۔

البتہ وان فاتح نے گردن موڑ کر ایک خاموش نظر مراد پہ ڈالی اور سر کو ہلکا سا خم دیا۔ یہ تشکر تھا' یا کسی سمجھوتے کا اشارہ۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چپ لگتا تھا اور اس کی امید بھری چمک آنکھوں سے غائب تھی۔

"ہمیں اس طرف جانا ہے۔" فاتح اپنا گھوڑا سب سے آگے لے گیا۔ وہ اب راستہ بتا رہا تھا اور وہ دونوں اس کی پیروی کر رہے تھے۔

ایڈم اداس لگتا تھا کہ وہ ایک بدعنوان حکمران کا پردہ فاش نہیں کر سکا۔

اوپر چمکتا چاند..... تارے..... اور اندھیری سڑک پہ دوڑتے تین گھوڑے۔ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر فضا میں کچھ تھا جو بھاری اور مہلک سا محسوس ہوتا تھا۔

سیسم سے زیادہ مہلک۔

☆☆☆

جس جنگل سے نکلنے میں ان کو چار دن لگے تھے' راستہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ اس جنگل کے اندر تین دن میں پہنچ گئے۔ فاتح اس دوران زیادہ تر خاموش رہا۔ ایڈم کا موڈ بدستور بہتر ہوتا گیا اور تالیہ بھی جلد نارمل ہو گئی۔ بلکہ جیسے جیسے سفر گزرتا جا رہا تھا' وہ پرجوش ہوتی جا رہی تھی۔

"واؤ..... ہم بالآخر واپس جا رہے ہیں۔"

"ہم واقعی واپس جا رہے ہیں نا' سر؟" وہ رات کو جنگل کے اندر اپنے اپنے بستر بنا رہے تھے جب ایڈم نے پھر سے پوچھا۔

گھنے رین فاریسٹ کے اونچے درخت خاموشی سے اس قطعے کو دیکھ رہے تھے جہاں خشک پتے گرے تھے اور فاتح ایک درخت کے ساتھ کھڑا رسیوں کا جھولا سا باندھ رہا تھا۔ آستین پیچھے کو چڑھائے وہ سنجیدگی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ ایڈم کے سوال پہ محض اتنا بولا۔

"تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟"

"آپ پہ ہے۔ مگر اپنے بابا پہ نہیں ہے۔" وہ جو مقابل درخت کے ساتھ اپنے بستر کو باندھ رہی تھی' مداخلت کرتے ہوئے بولی۔

"وہ تمہارا باپ ہے' تالیہ۔ اس کو تم سے محبت ہے۔" وہ کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے کی طرف پشت تھی اور وہ کام میں لگے تھے۔ ایڈم درمیان میں پتھر پہ بیٹھا باری باری دونوں کو دیکھتا تھا۔

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ آخر میں ہم میں سے کسی کو روک نہ لیں۔ یا پتا نہیں کیا..... مگر بابا ایسا ضرور کچھ نہ کر دیں گے جس سے ہمیں نقصان ہو۔" پھر چونک کے اس کی طرف پلٹی۔

"انہوں نے اس ساری ڈیل میں کوئی "کیچ" تو نہیں رکھا نا؟ کوئی شرط؟ کوئی..... کوئی ضرر دینے والی بات۔" اس کی الجھن ختم نہیں ہو رہی تھی۔

فاتح کے رسیاں کستے ہاتھ تھمے۔ صرف ایک پل کو۔ پھر اس نے کام جاری رکھا اور عام سے انداز میں بولا۔ "میں نے کہا نا' ہم صحیح سلامت واپس پہنچ جائیں گے تو تم اتنی وہمی کیوں ہو رہی ہو؟"

"تو آپ اتنے چپ کیوں ہیں۔"

"کیونکہ میں آگے کا سوچ رہا ہوں۔ مجھے ایک دنیا کو اپنی گمشدگی کے متعلق جواب دینے ہوں گے۔ چار ماہ کم عرصہ نہیں ہوتا۔" اس نے جھولا مکمل کر لیا تھا۔ پھر ایک کپڑا سامان سے نکالا' اسے جھاڑا اور رسیوں کے پنگھوڑے پہ ڈالا۔ اس بار جنگل میں پچھلی دفعہ کی طرح کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کیونکہ سامان ان کے پاس تھا۔

"آپ فکر مت کریں' تو انکو۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

فاتح نے پلٹ کے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی۔ "وان فاتح کو کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں پڑی کبھی' تالیہ۔"

شاید وہ ویسا ہی بے نیاز تھا جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ شاید یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس نے بس شانے اچکا دیے اور اپنا بستر بنانے لگی۔

"مراد راجہ اب کیا کرے گا' سر؟ سلطان کو بیٹی کی گمشدگی کی خبر کیسے دے گا؟ کیا بہانہ کرے گا؟"

"ایڈم یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنی نجات کے بارے میں سوچنا ہے اور یہ تم ہی تھے جو چار ماہ سے واپس جانے کے لیے شکایتیں کر رہے تھے۔ اب جب تمہیں راستہ مل رہا ہے تو بہتر ہے کہ ملاکہ کے ہیرو نہ بن سکنے کے غم کو بھول کے تم اپنے ماں باپ اور اپنی منگیتر کا سوچو۔"

وہ ایک دم یوں جھڑک کے بولا تو ایڈم کے چہرے کے سارے زاویے درست ہو گئے۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ "جی سر۔"

فاتح اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ وہ درختوں کے

درمیان فضا میں جھولتا رسیوں کا جھولا اور اس نے ان کی طرف سے کروٹ موڑ لی۔ وہ درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں چاند کی روشنی مدھم سی پہنچ پا رہی تھی۔ جانوروں کے بولنے اور کیڑوں کے رینگنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ دور کسی جھرنے کے بہتے پانی کی آواز بھی آ رہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ تالیہ چپ چاپ کام کرتی رہی اور ایڈم پتھر پہ بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالیہ کو مخاطب کیا۔ ''آپ جاتے ہوئے اپنے بابا سے کیا کہہ رہی تھیں؟''

''یہی کہ میں ان کے محل اور دولت پہ لعنت بھیجتی ہوں۔''

''جی اور اسی لیے آپ نے اپنے کپڑوں میں جو پوٹلی چھپا رکھی ہے اس میں اچھے خاصے سونے' ہیرے اور جواہرات جڑے زیورات موجود ہیں۔'' وہ تین دن سے جس راز کو دبائے پھر رہا تھا' آج اگلے بنا رہ نہ سکا۔ تالیہ نے پلٹ کے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا۔

''جائز اور حلال زیورات ہیں وہ۔ شہزادیوں کا حق ہوتا ہے۔ چوری کر کے نہیں لے جا رہی۔'' کپڑا جھٹک کے بستر پہ بچھاتے ہوئے وہ بولی تو ہاتھ کی سرخ انگوٹھی چمکی۔

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ ناجائز ہیں؟ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی محل اور دولت پہ لعنت بھیجنے والی نہیں ہیں آپ۔''

تنک کے بولا اور اپنا بستر بنانے اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ خفگی سے کچھ بڑبڑاتی ہوئی درخت کی طرف مڑ گئی۔

بالآخر ان کے درمیان تناؤ والی فضا ختم ہو رہی تھی۔ اور تالیہ کو یقین آنے لگا تھا کہ سب ٹھیک ہے اور فاتح اس سے کچھ نہیں چھپا رہا۔

ان کی طرف سے کروٹ موڑے فاتح کو اپنے سرہانے کھڑی اداس سی آریانہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتی وہ فکر مندی سے اس کی طرف جھکی۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا' ڈیڈ؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر لیا۔ ان دونوں کو بتایا ہی نہیں۔ جب ان کو معلوم ہو گا تو کیا ہو گا؟''

''آریانہ!'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے اداسی سے بڑبڑایا۔ ''میں ان کے برابر کا نہیں ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے سے اوپر رکھا ہے اور ''اٹس ویری لونلی ایٹ دا ٹاپ۔''

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جنگل کی ساری سیاہی ان آنکھوں میں سمٹ گئی اور دل بھی اندر تک تاریک ہو گیا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب دو درختوں کے درمیان بندھے جھولے نما بستر پہ سوئی تالیہ کی آنکھ کھلی۔

نرم سا لحاف اس نے چہرے سے اتارا اور پلکیں چند بار جھپکائیں۔ وہ چت لیٹی تھی سو اونچے درختوں کے آسمان کو چھوتے سرے نظر آ رہے تھے۔ مدھم چاندنی کہیں کہیں سے جھانک رہی تھی۔

پھر اس نے گردن چونکنے انداز میں موڑی۔

فاتح ایک پتھر زمین پہ کھینچتا اس کے جھولے کے قریب لا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ اٹھا کے روکا۔

''شش شش...... ریلیکس!'' اور پتھر قریب لا کے سیدھا ہوا۔ پھر اس پہ بیٹھا یوں کہ تالیہ کی طرف رخ تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ گرم لحاف اپنے گرد لپیٹے رکھا۔ جھولا ذرا سا جھولنے لگا' پھر ساکن ہو گیا۔

''کیا ہوا' فاتح صاحب؟'' تالیہ نے بال کان کے پیچھے اڑستے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا۔ ساتھ ہی مانوس سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ چاکلیٹ!!

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو جنگل میں آگے نکل گیا۔ وہاں کوکو کا درخت تھا۔ سوچا تمہارے لیے لے آؤں۔ یاد ہے تمہاری سالگرہ پہ تمہیں یہ بہت لذیذ لگا تھا۔'' وہ پتھر پہ بیٹھا مسکرا کے کہتا چاقو سے پھل کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

''آپ کو یاد تھا۔'' ہاتھ بڑھایا تو فاتح نے پھل اسے تھماتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ وہ قدرے تھکا تھکا لگ رہا تھا مگر لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ تین دن کی خاموشی کے بعد آج وہ' وہ فاتح لگا جو اسی جنگل میں چار ماہ پہلے اس کو تسلی دیتا تھا اور ہمت دلاتا تھا۔

''ظاہر ہے مجھے یاد تھا۔'' وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ آواز دھیمی تھی۔

''یہ اب بھی لذیذ ہے۔'' اس نے انگلی کٹے پھل کے پیالے میں ڈالی اور گودا منہ میں رکھا تو لذیذ رس اندر تک گھل گیا۔ وہ بس مسکرا کے اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''تالیہ!'' پھر نرمی سے پکارا۔ ''ان چار ماہ میں تمہارے خیال میں تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟''

''چار پانچ کلو وزن بڑھا ہے میرا۔ اور ہاں چند جنگی امور کی تربیت لی ہے میں نے۔ شاہی آداب سیکھے ہیں۔ ہر روز ڈھیروں زیورات خود پہ لاد لینے کی مشق کی ہے اور......''

''تالیہ!'' اس نے نرمی سے ٹوکا۔ ''باہر نہیں' تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟ تم نے کیا سیکھا ہے؟''

اس نے گودے بھری انگلی لبوں پہ رکھ کے نکالی اور سوچا۔ ''پتا نہیں' تو انکو۔ شاید کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اب بھی دولت کی وہی حرص ہے مجھے۔ اتنے زیورات ساتھ لائی ہوں۔ خزانہ اب بھی چاہیے مجھے۔ ہاں کوشش کروں گی کہ پرانی روش چھوڑ کے نئی زندگی شروع کروں۔''

''جب میں تمہیں چھوڑ دوں گا (تالیہ کی پلکیں جھکیں مگر پھر اس نے ان کو اٹھا لیا اور مسکراتی رہی) تو تم کیا کرو گی؟''

''میں شاید امریکہ چلی جاؤں۔ اپنے سارے جائز مال و دولت کے ساتھ اور بطور آرٹسٹ ایک نئی زندگی شروع کروں۔'' پھر ٹھہری۔ پھل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

اندھیری رات میں وہ لحاف میں لپٹی جھولے پہ بیٹھی تھی اور وہ سامنے پتھر پہ بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں ہم نے یہ نکاح صرف مراد راجہ کو بلیک میل کرنے کے لیے کیا تھا' ورنہ وہ زبردستی میری شادی سلطان سے کر دیتا اور اب ہم اس کو ختم کر دیں گے۔ لیکن...... میں چاہوں گی کہ ہم اچھے دوست رہیں۔ میں چھٹیوں میں ملائیشیا آنا چاہوں گی اور بھلے آپ وزیراعظم بھی بن جائیں' آپ ایڈم اور میرے لیے ہمیشہ وقت نکالیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہم تینوں مل بیٹھ کے ان دنوں کو یاد کیا کریں گے۔ ٹھیک ہے نا' تو انکو؟''

''میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ مگر میں ایک اور بات اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔'' وہ نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے ابرو بھینچ کے اسے حیرت سے دیکھا۔

''وہ کیا؟''

''تمہاری حقیقت جاننے سے قبل میں تمہیں تاشہ کہا کرتا تھا۔ اسی جنگل میں' میں نے تمہیں پہلی دفعہ تالیہ کہنا شروع کیا تھا۔ جس لڑکی کو میں تاشہ کہہ کے بلاتا تھا وہ میرے لیے ایک ناقابل بھروسا' بے ایمان اور اداکارہ قسم کی عام سوشلائیٹ تھی۔ مگر جب میں نے تمہیں جانا...... کہ تمہارا پیشہ کیا ہے اور تم ہی حالم ہو' تو میں نے تمہیں تمہارے اصل نام سے پکارنا شروع کیا۔ پھر بھی تاشہ نہیں کہا۔ کبھی تمہیں شہزادی نہیں سمجھا۔ کیونکہ اتنا زیور لاد کے' تاج اور زرتار لباس پہن کے بھی تم میرے لیے وہی تالیہ تھیں جو میری دنیا کی باسی تھی۔ لیکن اس روز......'' وہ ٹھہرا۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

''اس روز قید خانے میں جب تم سپاہیوں پہ غرائیں تو میں نے تمہاری وہ آواز سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔''

وہ ذرا سی شرمندہ ہوئی۔ فوراً وضاحت دینا

چاہی۔ ''وہ تو میں غصے میں......''

''نہیں تالیہ! مجھے برا نہیں لگا تھا۔ بلکہ مجھے اچھا لگا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟''

وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی: ''کیوں؟''

''کیونکہ بنا کسی تاج اور شاہی لباس کے..... اس دن تم مجھے شہزادی لگی تھیں۔ وہ تمہارا اصل روپ تھا۔ تمہارا ریئل سیلف۔ تم مجھے تو انکو کہتی ہو۔ ہماری دنیا میں اس لفظ کا مطلب ''مائی باس'' ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت میں نے جانا تھا کہ تمہارا اصل مقام ایک باس کا مقام ہے۔

تم نے ان چار ماہ میں اپنے اصل روپ کو دریافت کرلیا ہے' تالیہ! تم ایک شہزادی ہو۔ ایک دانا شہزادی۔ تم روپ بدل بدل کے تنکو کامل کی ملازمہ یا کوئی ویٹرس یا کوئی سستی سوشلائیٹ بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ تم یہ بہروپ لیے پھرتی ہو' سچ اس لیے نہیں بول سکتیں کیونکہ تم نے اپنے اصل کو کبھی دریافت ہی نہیں کیا تھا۔''

وہ ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نے ان چار ماہ میں جو سیکھا ہے' اس کو ضائع مت کرو۔ واپس جاکے تم اس کو اپنی زندگی پہ لاگو کرنا۔ پھر تمہیں کسی چیز کا خوف سچ سے دور نہیں کرے گا۔ تم اپنے ساتھ سچی ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے اوپر ملمع چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ تمہیں اپنے اصل روپ پہ اعتماد آجائے گا۔

میں اس تالیہ کو کے ایل میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں جو قید خانے کے سپاہیوں پہ غرا رہی تھی۔ ان کو ظلم کرنے سے روک رہی تھی۔ یہی چیز تمہاری سب سے بڑی طاقت ہوگی۔ تالیہ تمہیں کسی 'خزانے' کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں صرف وہی بننا ہے جو تم اس قدیم ملاکہ میں تھیں۔''

''میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آرہیں۔ میں چوری کرنا چھوڑ کے نئی زندگی شروع......'' اس نے کہنا چاہا مگر.....

''ایک وقت آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس وقت اس رات کو یاد کرنا۔ تم یاد کرنا کہ میں تمہیں ایسی ہی تالیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ شہزادی تاشہ جیسی تالیہ۔ صرف تاشہ جیسی نہیں۔ بلکہ کسی باس کی طرح۔ نڈر اور جرأت مند اور اس وقت اگر کوئی تمہارے اس روپ کو پسند نہ کرے تو تم اس کی پرواہ نہیں کروگی۔ چاہے تمہیں ناپسند کرنے والوں میں' میں ہی کیوں نہ شامل ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نیم رضامندی سے سر ہلایا۔ ''میں اپنے اصل سے نہیں بھاگوں گی۔''

''اور ایڈم......'' اس نے گردن موڑ کے دور سوتے ایڈم کو دیکھا۔ ''اس نے اس دنیا سے یہ سیکھا ہے کہ انسان کو اپنی خوشی اپنے اندر خود ڈھونڈنی ہوتی ہے۔ بجائے دوسروں کے پیچھے بھاگتے رہنے اور دوسروں کی رائے پہ انحصار کرنے کے' انسان کو اپنی ذات پہ اعتماد کرنا سیکھنا ہوتا ہے۔ ہم اپنے سب سے اچھے دوست اور سب سے اچھے جج خود ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ تم ایڈم سے رابطے میں رہو اور اس کو بیساکھیوں کے بغیر اپنے قدموں پہ چلنا سکھاتی رہو۔ تمہیں اور اسے اس دنیا سے سیکھے اسباق بھولنے نہیں چاہئیں۔''

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تو تالیہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ''ہم اچھے دوست تو رہیں گے نا' فاتح صاحب؟'' یوں ہی اس کو نام سے پکار دیا۔

''میں ایسا ہی چاہتا ہوں کہ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں۔'' وہ مسکرا کے پلٹا تو وہ پکار اٹھی۔

''اور آپ نے کیا سیکھا؟''

اس اندھیری رات میں درختوں کے ساتھ کھڑا فاتح ٹھہر گیا۔

پھر آہستہ سے مڑا اور سادگی سے مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ میں جیسا تھا ویسا ہی رہوں گا۔''

''ظاہر ہے۔'' تالیہ نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ ''آپ سیلبرٹی ہیں' پرفیکٹ ہیں۔

آپ میں خامیاں کیسے ہو سکتی ہیں جن کو اصلاح کی ضرورت ہو؟'' روٹھے پن سے بولی تو اس نے جواب نہیں دیا۔

''آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ اس میں وہ پاپ کارن بھی ہیں۔''

''وہ تم رکھ لو۔ اس وقت تک جب تک میں اسے واپس نہیں مانگتا۔'' وہ مبہم انداز میں کہتا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تالیہ بھی واپس لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔

کروٹ موڑ کے لیٹے ایڈم کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس نے حرف حرف سنا تھا۔

''وان فاتح یہ سب مجھے ڈائریکٹ بھی کہہ سکتے تھے' پھر یہ تالیہ کو کیوں کہا کہ وہ مجھے کہیں۔ تین دن سے یہ مجھے اگنور کررہے ہیں۔ ہونہہ۔'' اس نے خفگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ اسے سو جانا چاہیے تھا۔

صبح انہوں نے ''دروازے'' کی طرف سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

جنگل پہ صبح اتری تو گھنے درختوں نے دیکھا' تین مسافر قطار میں پیدل چلتے جارہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے مرد کی گردن میں سنہری چابی لٹک رہی تھی جو اس کو راستہ دکھا رہی تھی۔ گھوڑے وہ جنگل کے باہر چھوڑ آئے تھے۔ چہروں پہ مٹی لگی تھی اور لباس میلا ہو رہا تھا مگر وہ چل رہے تھے۔

ہر اٹھتے قدم کے ساتھ تالیہ کو ان چار ماہ کا گزرا ایک ایک پل یاد آرہا تھا۔

(چار ماہ قبل وہ کے ایل میں ان باؤ کے گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔ زمین میں ڈھکن سا کھل گیا تھا اور نیچے سیڑھیاں جارہی تھیں۔ فاتح مشکوک سا تالیہ کو برہمی سے دیکھ رہا تھا اور وہ خزانے کی طمع میں زینے اتر رہی تھی۔)

جنگل میں وہ تینوں اس مقام تک پہنچے تو فاتح نے گردن سے زنجیر اتاری اور سنہری چابی زمین پہ رکھی۔ ایک دم ہوا چلی اور سوکھے پتے اڑتے گئے۔

جگہ خالی ہوتی گئی۔ وہاں ایک لکڑی کا ڈھکن نظر آنے لگا۔

(وہ رین فاریسٹ کے غار میں کھڑی تھی۔ ساکن، ساکت۔ اس کے سر کے اوپر سانپ تھا جس کو فاتح چاقو سے مار رہا تھا۔ سانپ کی گردن کٹ کے گر گئی۔ وہ خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔)

پتے ہٹ گئے اور ڈھکن صاف نظر آنے لگا۔ وان فاتح نے تیزی سے ڈھکن کھولا۔ نیچے زینہ سا بنا تھا۔ ان تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ تالیہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ خوشی اندر باہر بھرنے لگی۔

(وہ تینوں جنگل میں بیٹھے تھے۔ درختوں کی چھایا تلے اور وہ ہرن کی گردن پہ چاقو پھیر رہی تھی۔ خون کے چھینٹے وان فاتح کے اوپر آگرے تھے۔)

وہ قدم بہ قدم زینے اترنے لگے۔ ایڈم بار بار دیواروں کو ہاتھ لگا کے ٹٹولتا۔ کیا وہ واقعی واپس جارہے تھے؟ وہ بے یقین تھا۔

(وہ پنجرے میں بند تھے اور پنجرہ اٹھائے گھوڑا گاڑی سڑک پہ سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ تالیہ کے سر پہ چوٹ لگی تھی اور درد ہو رہا تھا۔)

زینے اترتے وقت وان فاتح سب سے آگے تھا۔ دروازے پہ وہ پہلے پہنچا۔ تالیہ نے چابی مانگی مگر وہ خود آگے آیا اور تالے میں چابی ڈالی۔ پھر زنجیر ہٹا کے اسے کھولا۔ لکڑی کا قدیم دروازہ کھلتا چلا گیا۔

(وہ بنداہارا کے محل میں کھڑی اپنے بابا سے پہلی دفعہ مل رہی تھی۔ اس نے جامنی لباس پہن رکھا تھا اور کان کے اوپر بڑا سا پھول لگا تھا۔)

دروازے کے پار وہی سب تھا جو پہلے نظر آیا تھا۔ طویل راہداری جو کیلی تھی۔ وہ تینوں تیزی سے اس پہ چلنے لگے۔ تالیہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ایڈم اب بھی دیواروں کو بے یقینی سے ٹٹول رہا تھا۔

(وان فاتح ابوالخیر کی حویلی کی رسوئی میں کھڑا صراحی سے پیالیوں میں قہوہ انڈیل رہا تھا۔ دھار کی صورت میں گرتا قہوہ پیالی کو بھر رہا تھا۔ پتوں کے

کڑھنے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔)

ان کے پیر پانی میں ڈوب رہے تھے اور اوپر سے قطرے بھی برس رہے تھے مگر وہ چلتے گئے... چلتے گئے... چلتے گئے۔

(ایڈم کتب خانے میں کتابیں اور قلم کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو وہ شعلہ دکھا چکا تھا اور کاغذ دھیرے دھیرے جل رہا تھا۔)

راہداری ایک دوسری پانی بھری راہداری کے ساتھ آملی۔ دو دریاؤں کا سنگم۔

تالیہ کی آنکھیں فرط مسرت سے بھیگنے لگیں۔

صرف فاتح تھا جو سنجیدہ تھا۔ بے تاثر۔ سرد۔

(وہ دونوں ابوالخیر کی حویلی کی چھت پہ اکڑوں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دور تک پھیلے اندھیرے میں ڈوبے ملاکہ کو دیکھ رہے تھے۔)

دو دریاؤں کے سنگم پہ تالیہ نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا مگر وہ نئی زندگی کی شروعات تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی' یہاں تک کہ سب سے آگے نکل گئی۔

(وہ ملکہ یان سوفو کے محل میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور طبیب کو ڈانٹ رہی تھی۔ اس کا تاج سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا اور ملکہ دنگ کھڑی اس کو اپنی حمایت کرتے دیکھ رہی تھی۔)

فاتح اب ست روی سے چل رہا تھا۔ اسے اب واپس پہنچنے کی جلدی نہ تھی۔ ایڈم کا چہرہ اب جیسے پرسکون ہونے لگا تھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا۔



(ایڈم دربار میں رکھی سنہری میز پہ موجود اپنے نام کی تختی پہ مسحور سا ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ساتھ ہی دستے رکھے تھے جن کے اوپر لکھا بنگارایا ملایو جگمگا رہا تھا۔)

دوسرے دریا کے پار ہی زینہ تھا۔ تالیہ بھاگ کے اس پہ چڑھی۔ سامان کی پوٹلی سنبھالے' وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ فاتح بن رامزل کے قدم اتنے ہی بھاری ہو رہے تھے۔

(مراد راجہ سختی سے اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میز پہ رکھی اس کی ننھی سی لکڑی کی کشتی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔)

لکڑی کا ڈھکن اس نے ہٹایا تو سیاہ رات دکھائی دی۔ وہ باہر نکلا تو خود کو سن باؤ کے صحن میں پایا۔ تاروں بھرا آسمان اور... اس نے گردن موڑی... نئے ملاکہ میں جدید تراش خراش سے آراستہ سن باؤ کا گھر۔

(وہ جیا کے چبوترے پہ کھڑا بلند آواز میں لوگوں سے مخاطب تھا' مگر وہ گردنیں افسوس سے ہلاتے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔)

ایڈم باہر نکلا تو بالکل دنگ رہ گیا۔ پھر بالآخر کھل کے مسکرایا۔ پیروں پہ گول گول گھوم گیا۔ وہ جدید ملاکہ ہی تھا۔ وہ جدید گھر ہی تھا۔

(وہ تینوں سن باؤ کے برآمدے میں زمین پہ بیٹھے تھے اور چینی قاضی ان سے ان کی رضامندی لے رہا تھا۔ گواہ بنا ایڈم خالی دل اور خالی نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔)

فاتح نے اوپر قدم رکھے اور سیدھا کھڑا ہوا تو ڈھکن خود بخود بند ہو گیا۔ زمین برابر ہو گئی۔ کنوئیں کا پانی بھر آیا۔

ایسے جیسے وہاں کوئی ڈھکن تھا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

(وہ دونوں مجسمے کی جگہ کے نیچے زمین میں سامان بھر رہے تھے۔ سن باؤ کے قدیم صحن میں تالیہ اور ایڈم تنہا تھے اور ان کے ہاتھ تیز تیز کام کر رہے تھے۔)

''سلطان ساز''

اس نے خواب میں دیکھا کہ...

وہ راہداری میں کھڑی ہے...

سامنے چند آفسز بنے ہیں...

جن کی دیواریں شیشے کی ہیں...

ایک آفس کے اندر کا منظر وہ صاف دیکھ سکتی ہے۔

اس میں ایک سیاہ کوٹ والا آدمی کھڑا ہے...

میز سے ٹیک لگائے' سینے پہ بازو لپیٹے

وہ تالیہ کی طرف دیکھ رہا ہے...

اور تالیہ...

وہ راہداری میں کھڑی ہے...

ہاتھ میں ایک بڑا سا زرد پلے کارڈ ہے'

جسے وہ شیشے کے دروازے پہ چسپاں کر رہی ہے!

آفس کاریڈور میں نیم اندھیرا ہے...

جیسے اکثر لوگ جا چکے ہوں...

کارڈ چسپاں کر کے وہ مڑتی ہے...

اور ایک چبھتی ہوئی نظر اس آدمی پہ ڈالتی ہے...

☆☆☆

تاریخ تھی سولہ جولائی۔ شہر تھا جدید ملاکہ۔ سن تھا دو ہزار سولہ اور وقت تھا رات کے ساڑھے گیارہ بجے' جب وہ تینوں سن باؤ کی حویلی میں کھڑے تھے۔

زمین اپنے خفیہ راستوں کو چھپائے برابر ہو چکی تھی۔ ایڈم ٹی وی چلا کے تاریخ معلوم کر رہا تھا اور تالیہ بے یقینی سے گول گول گھوم کے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔

صرف وان فاتح دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے بے تاثر سا کھڑا تھا۔ صرف اسے معلوم تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ گردن میں پڑی زنجیر ہر گزرتے لمحے بھاری ہوتی جا رہی تھی۔

''تم اس کو اپنی جیب میں نہیں ڈالو گے۔ اس کو ہاتھ یا گردن میں پہنے رکھنا۔'' راجہ مراد کی آواز ذہن میں گونج رہی تھی۔ ''اس کو اپنی جلد کے ساتھ لگائے رکھنا ورنہ یہ راکھ بن جائے گی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی یہ ٹوٹ جائے گی۔ اور تمہارے ذہن سے سب کچھ محو ہو جائے گا جو وہ امر لمحوں کے درمیان میں ہوا تھا۔''

''اور میری یادداشت واپس کیسے آئے گی؟''

خالی بوتل دونوں کے درمیان میز پہ رکھی تھی۔ اس کو دیکھ کے فاتح نے پوچھا تھا۔

''نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں آئے گی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے غلام فاتح!'' وہ ایک دم غصے سے بولا تھا۔

پولیس کے سائرن سنائی دینے لگے تو ایڈم دروازے پہ جانے لگا۔ فاتح نے اسے روک دیا۔ ان دونوں کو صحن میں چھوڑ کے اس نے راہداری عبور کی اور باہر کا سرخ دروازہ کھولا۔

باہر چھوٹی صاف ستھری سڑک تھی جس کے دونوں اطراف میں ایسے ہی تاریخی گھر اور ریستوران بنے تھے۔ دکانوں کے باہر چھپر تلے لوگ کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔

سن باؤ کے گھر کے سامنے پولیس کی کار کھڑی تھی اور دو آفیسرز گھر کے دروازے پہ منتظر کھڑے تھے۔ فاتح نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل آیا۔

''السلام علیکم فاتح صاحب!'' ایک افسر نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ کے گارڈ کی کال آئی تھی کہ چور گھس آئے ہیں۔ خیریت ہے؟ ہم اندر آ جائیں۔'' ساتھ ہی ایک نظر اس کے کرتے پاجامے پہ ڈالی۔

''نہیں' گھر میں نہیں۔ باہر سڑک پہ لوٹا ہے انہوں نے۔'' وہ گہری سانس لے کر بتانے لگا۔

''میں ابھی تھانے آ کے پورا واقعہ بتاتا ہوں' فی الحال گھر میں کچھ میڈیا والے موجود ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں آتا ہوں۔''

''مگر سر......!''

''کیا تم مجھے نہیں جانتے آفیسر؟ تمہارا ڈپٹی کمشنر میرا کلاس فیلو ہے۔ اس سے کہو کہ میرا انتظار کرے۔ میں خود آ کے رپورٹ لکھواؤں گا۔'' وہ دو

ٹوک انداز میں بولا۔ ''مجھے لباس بدل کے منہ ہاتھ دھونے دو۔'' ایک افسر بے چین ہوا تو دوسرے نے فوراً اشارہ کیا۔

''جی سر' ڈی سی پی صاحب نے ذکر کیا تھا۔ ٹھیک ہے' ہم آپ کا انتظار کریں گے۔''

فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کیا (اب جاؤ) اور واپس مڑ گیا۔

تالیہ اور ایڈم کو وہاں سے بھیجنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ جیسے ہی وہ گھر سے نکلے' وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا۔ چار ماہ پہلے ایڈم کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہی عادتاً اس نے کار کی چابی دروازے کے ساتھ بنی کھونٹی پہ لٹکائی تھی۔ وہ وہیں تھی۔ اس کا لوہا اب بھی ٹھنڈا تھا۔

وہ باہر سڑک پہ آیا تو تالیہ اور ایڈم جا چکے تھے۔ اس نے کار سے اپنا بیگ نکالا اور واپس برآمدے میں آ کر اسے کھولا۔ گردن میں جھولتی چابی ہر گزرتے پل بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

''پلان کیا ہے' ڈیڈ؟'' کونے میں کھڑی آریانہ کی آواز نے اسے چونکایا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ بازو سینے پہ لپیٹے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میرے پاس صبح تک کا وقت ہے' اور مجھے چند اہم کام کرنے ہیں۔'' لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے وہ برآمدے میں بچھی مسہری تک آیا اور وہاں بیٹھا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ نیلی روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

''کیا کر رہے ہیں' ڈیڈ؟'' وہ ابھی تک فاصلے پہ کھڑی تھی۔ فاتح جلدی جلدی کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

''ایڈم کو ای میل لکھ رہا ہوں۔ جو نہیں بتایا وہ بتا رہا ہوں۔''

''اور تالیہ؟ اس کو چھوڑ دیں گے آپ؟''

ٹائپ کرتی اس کی انگلیاں تھمیں۔ گلہ آمیز نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ ''چھوڑنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟''

''تو پھر اسے کہا کیوں تھا کہ چھوڑ دیں گے؟''

''چھوڑ تو دوں گا۔ یہی بتانے کے لئے میل لکھ رہا ہوں۔'' وہ اب سرعت سے ٹائپ کر رہا تھا۔ ''یہ الگ بات ہے کہ ایسا لگ رہا ہے جیسے.....''

''جیسے؟''

''جیسے مراد راجہ نے چند گھنٹے دیے ہوں کہ وان فاتح.... یہ اتنا وقت ہے تمہارے پاس' اس کے بعد تم مر جاؤ گے۔ سو جو کرنا ہے اس دوران کر لو۔ اب تم بتاؤ آریانہ...... کیا مرنے سے پہلے کوئی کسی کو چھوڑنے کی خواہش کر سکتا ہے؟''

سن باؤ کے قدیم برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ کنویں کے اندر جیسی خاموشی۔ آریانہ دکھ سے اسے دیکھے گئی۔

''ڈیڈ.... اس کو چھوڑ دیں۔ جب سب بھولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کو خود سے کیوں باندھ کے رکھتے ہیں؟''

وہ ٹائپ کرتے ہوئے رکا تو وہ جلدی سے بولی۔

''واپس آ کے میل مکمل کرتا ہوں۔ ابھی ہمت نہیں ہو رہی۔'' اس نے آدھی میل چھوڑ کے اسکرین فولڈ کر دی۔ پھر وہ اٹھا اور اوپر کی طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا تو زینوں کے اختتام پہ بیٹھی آریانہ نے گردن اس کی جانب موڑی۔

''ان چار ماہ کی ساری نشانیاں مٹا آئے ہیں آپ؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

اس نے سیاہ شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ شیو بن چکی تھی۔ بالوں کو قدرے تراش کے پرانی حالت میں لے آیا تھا۔ قلموں سے بال سفید تھے' باقی دائیں طرف مانگ نکال کے گیلے کر کے جما رکھے تھے۔ گردن میں زنجیر اب بھی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ میں شاپر تھا جس میں ملاکہ والے کپڑے اور جوتے تھے۔ اپنے تمام زخموں پہ اس نے نئے زمانے کے بینڈ ایج ایڈ لگا دیے تھے۔

''نشانیاں مٹانے کے سوا چارا ہے کیا؟ کل جو وان فاتح نیند سے جاگے گا' اس کو کسی بھی چیز پہ شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ شدید ذہنی پریشانیوں میں گھر جائے گا۔ اس کے لیے ہر چیز نارمل ہونی چاہیے۔'' وہ تیز تیز زینے پھلانگ رہا تھا۔ آخری زینہ عبور کر کے آگے بڑھ گیا تو آریانہ نے پکارا۔ ''اور جسم پہ لگے ان ان گنت زخموں کا کیا؟''

''ان ہی کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔''

کار کی چابی اٹھائے وہ تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے لگے کوڑے دان میں سیاہ شاپر میں مقید چیزیں پھینکیں اور ڈھکن بند کیا۔ گویا زندگی کا ایک باب بند کیا۔

چند لمحوں کے لیے اندر تک سب خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن کے ایک کشادہ کمرے میں موجود تھا۔ آفس کرسی پہ ڈپٹی کمشنر براجمان تھا اور اس کے سامنے بیٹھا فاتح کندھے اچکا کے کہہ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹینڈ پہ کیمرہ نصب تھا جو اس کا بیان ریکارڈ کر رہا تھا۔

''میں ملاکہ تین دن کے لیے آیا تھا مگر تین گھنٹے بھی نہ رک سکا۔ میں ملاکہ سے واپس جا رہا تھا کہ میرا باڈی گارڈ میرے پاس آیا۔ یہ ریکارڈ ہو رہا ہے نا؟'' اس نے اپنے دوست کو اشارہ کیا تو اس نے سر کو خم دیا۔

''گڈ۔ مجھے یہ ویڈیو ای میل کر دینا۔ میرا دماغ اس وقت سب چیزوں کو مکس اپ کر رہا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کل صبح جب میں یہ ویڈیو دیکھوں تو مجھے یاد رہے کہ ان تین گھنٹوں میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔'' اس نے تین انگلیوں سے کنپٹی مسلی۔

''آپ کہہ رہے تھے...؟''

''ہاں... میرا باڈی گارڈ آیا تھا میرے پاس۔ وہ میرے ساتھ گاڑی میں ہی تھا جب تین آدمی آئے اور انہوں نے ہم پہ پستول تان لیے۔ پھر ہمیں باہر نکالا۔ وہ مجھ سے والٹ' پیسے اور فون مانگ رہے تھے۔ وہ تین چیزیں جو ہم سارے بچاتے ہیں۔ مگر.....'' کندھے اچکا کے کیمرے میں دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔ ''اتنی آسانی سے وان فاتح ہار کب مانتا ہے؟ میں بحث اور سوال وجواب کرنے لگا۔ ان کو میرے سوال برے لگے تو انہوں نے جارحیت کا مظاہرہ کیا۔''

''کیسے؟'' آفیسر نے تشویش سے اسے دیکھا۔

''ہاتھا پائی ہوئی۔ اور وہ موبائل' بٹوہ سب چھین کے لے گئے۔ مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کوئی سرنج بھی لگائی۔'' اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا جو قمیص کی آستین سے ڈھکا تھا۔ ''اس کے بعد سے میرا دماغ غنودگی کی سی کیفیت میں ہے۔ میرا باڈی مین.. (صبح کی) باڈی گارڈ مجھے گھر لایا۔ ہم وہاں تماشہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو خبر ہو کہ مجھے یوں لوٹا گیا ہے۔ اب بھی میں رپورٹ نہیں کروانا چاہتا۔ اس سب کو صیغہ راز میں رہنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے سر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں اس بات کو کور کر دوں گا۔'' پھر آفیسر نے غور سے اسے دیکھا۔ ''میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے آپ پہ تشدد بھی کیا لیکن... انہوں نے آپ سے گاڑی کیوں نہیں چھینی؟''

وان فاتح کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی مگر چہرہ پرسکون رہا.......

''میں نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے' یہ ضروری نہیں ہوتا قمرالزمان!''

''خیر.... ہم اپنے طور سے تفتیش کریں گے' جو بھی سامنے آیا آپ کو مطلع کیا جائے گا۔''

وان فاتح اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر کیمرے کو دیکھا۔ ''مجھے یہ ویڈیو بھیج دینا۔ لازمی۔ تین منٹ سے زیادہ مت لینا۔ مجھے بار بار تم سے سوال کرنا اچھا نہیں لگے گا۔'' زور دیا۔

''جی سر۔ اور آپ کا میڈیکل چیک اپ.....''

''اس کی ضرورت نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ سارا واقعہ ذہن سے پھسل رہا ہو۔'' اس نے مصنوعی نقاہت سے کہتے ہوئے کنپٹی کو چھوا۔ افسر نے کیمرہ آف کیا تو فاتح نے ہاتھ نیچے کرلیے۔ وہ ایک دم بہتر نظر آنے لگا۔ بس عجلت میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور خدا حافظ کہہ کے باہر نکل گیا۔ کمشنر اس کو الجھی سوچتی نگاہوں سے جاتے دیکھنے لگا۔

وان فاتح کو اتنی جلدی کیوں تھی؟ جیسے وقت کم ہو اور اسے بہت کچھ کرنا ہو۔ جیسے اسے کسی جگہ پہنچنا ہو۔ اتنی رات میں؟

صبح ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا' جب سن باؤ کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو چہرے پہ شدید تھکن کے آثار تھے۔

رات کے اس پہر راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا آگے آیا۔ برآمدے کی مدھم بتی جل رہی تھی اور لکھائی کی میز پہ لیپ ٹاپ فولڈ شدہ دکھائی دے رہا تھا اور چارجنگ پہ تھا۔ وہ پژمردہ سا کرسی تک آیا اور اسکرین اوپر اٹھائی۔ آدھی لکھی ای میل سامنے جگمگا رہی تھی۔

کیا اب وہ ''چھوڑ دینے'' کی باتیں لکھ سکے گا؟ بالخصوص ان گزشتہ چند گھنٹوں کی 'دوڑ دھوپ' کے بعد علم میں آنے والی 'باتوں' کے بعد.... کیا اب بھی وہ اس کو چھوڑ سکے گا؟

وہ کرسی پہ گر سا گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ اس نے بھول جانے کا فیصلہ تب کیا تھا جب راجہ مراد نے اس کے سامنے کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب نہیں لگا تھا کہ تالیہ کو چھوڑنا اتنا کٹھن ہوگا۔ اور اب بھی وہ چھوڑ دیتا اگر یہ چند گھنٹے درمیان میں نہ آئے ہوتے۔

مگر اب نہیں۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور لیپ ٹاپ قریب کھسکایا۔ آنکھیں سپاٹ ہوگئیں اور انگلیاں کی بورڈ پہ حرکت کرنے لگیں۔

''اس کو چھوڑ دیں' ڈیڈ۔ اس کو آزاد کر دیں۔ اپنا نہ سوچیں۔ اس کا سوچیں۔''

آریانہ اس کے کندھے کے پیچھے آکھڑی ہوئی اور التجا کرنے لگی۔ وہ کی بورڈ سے نظریں ہٹائے بغیر ٹائپ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے اسے بھول جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کیوں کہ تب مجھے اپنی یہ جدید دنیا واپس چاہیے تھی اور ان دونوں کو بھی۔ لیکن اب اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ مجھے اپنی ''امید'' بھی واپس چاہیے۔ ملکہ درست کہتی تھی' میں واقعی خود غرض ہوں۔'' آواز میں آنچ سی تھی۔

ای میل مکمل کر کے اس نے اسے شیڈول کیا۔ رات پونے بارہ شروع کی گئی' میل صبح چار بجے کے قریب مکمل ہوئی تھی۔ اختتام آغاز سے مختلف تھا۔ میل بھیجنے کے وہ رکا اور ایک دوسری میل کی۔

''یہ ایڈم کو بیس جولائی کی صبح ملے گی۔ اور تب ہی ملنی چاہیے۔'' ایسے دہرایا جیسے بالآخر اس نے اپنے مقصد کو جان لیا ہو۔ آریانہ خاموشی سے کام کرتے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ذاتی ای میل کھولی تو سامنے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ اس نے اس کو ان چھوا رہنے دیا اور اسکرین فولڈ کر دی۔

پھر گلے کی زنجیر اٹھا کے آریانہ کو دکھائی۔ ''اب اس سے نجات حاصل کرنی ہے۔ اس کے ٹوٹتے ہی مجھے نیند آجائے گی اور صبح میرے ذہن کی سلیٹ خالی ہو چکی ہوگی۔ اور میں خود بھی بھول چکا ہوں گا کہ وہ چابی.... کہاں گئی!''

یہ کہہ کے وہ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ گردن میں پڑی زنجیر کو ابھی تک ہاتھ میں مروڑ رکھا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

ایک نئی زندگی کی طرف۔

☆☆☆

سترہ جولائی کی صبح ملاکہ کے باسیوں کو جگانے کے لیے روشنی نے ہر کھڑکی پہ دستک دی تو سن باؤ کے گھر کا وہ کمرہ بھی منور ہونے لگا۔ بیڈ پہ آڑے ترچھے لیٹے وان فاتح کی آنکھ تیز روشنی سے کھلی تو وہ جیسے ... پھر اٹھنا چاہا تو جسم میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ واپس لیٹ گیا اور آنکھیں بار بار جھپکیں۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ وہ کہاں تھا' کیوں تھا' کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

پھر دھیرے سے وہ اٹھا اور اطراف میں دیکھا۔

وہ اپنے ملاکہ والے گھر کے کمرے میں تھا۔ نیند اتنی گہری آئی تھی کہ یوں لگتا تھا عرصے بعد جاگا ہو۔

سوچوں کو مجتمع ہونے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ اٹھ کے بیٹھا اور تعجب سے کمرے کو دیکھا۔

آہستہ آہستہ یادداشت واپس آنے لگی۔

وہ تو رات کے ایل واپس جا رہا تھا۔ پھر رک کیوں گیا؟ یاد کیوں نہیں آرہا تھا؟

سکندر' جولیانا اور عصرہ شام سے پہلے چلے گئے تھے۔ پھر وہ سمندر پہ گیا تھا۔ پھر وہ بیگ سمیٹ کے جا رہا تھا۔ پھر؟ وہ کیوں رک گیا؟

سیل فون کی تلاش میں ہاتھ مارا تو سائیڈ ٹیبل خالی تھا۔ وہ اچنبھے سے اٹھا۔ جسم بے حد درد کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں مسلنے کو ہاتھ اوپر لایا تو چونکا۔ ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔ فاتح کی آنکھوں میں بے یقینی امڈ آئی۔ ہاتھ الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ پھر بازو اٹھا کے اوپر نیچے گھمایا۔ وہاں بھی بینڈ لگی تھی۔

وہ قدم قدم چلتا دیوار پہ آویزاں آئینے تک آیا اور پھر بالکل منجمد ہو گیا۔

شیشے میں دکھائی دیتی اس کی شکل تو وہی تھی مگر.... کچھ مختلف تھا۔ اس نے بے یقینی سے خود کو دیکھا۔ پھر مزید قریب آیا۔ آنکھ اور کنپٹی کے قریب زخم تھا۔ گردن پہ خراشیں۔ اس نے قمیص گریبان سے نیچے کی' بٹن کھولے اور شرٹ اتاری۔ پھر گھوم کے دیکھا۔ کمر اور کندھوں پہ زخموں کے نشان تھے۔ سینے پر بھی ضربیں لگی تھیں۔

اس نے پیشانی چھوئی اور آنکھیں موندیں۔ آخری چیز کیا ہوئی تھی؟

ہاں وہ ایڈم کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا۔

ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔

اور ایڈم کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے کچھ دے رہا تھا۔

سنہری چیز۔ پھر کیا ہوا تھا۔

مگر ذہن بالکل صاف تھا۔ تختہ سیاہ کی طرح صاف۔ بلیک ہول کی طرح خالی۔

پھر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ زینے پھلانگے اور نیچے آیا۔ برآمدے میں آکے وہ ٹھٹکا۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھا تھا۔ اس نے تو کل سامان سمیٹ کے کار میں رکھا تھا اور وہ کے ایل واپس جا رہا تھا پھر اب؟

وہ قریب آیا اور اسکرین روشن کی۔ سامنے آفیسر کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ وہیں میز کنارے جھکے جھکے فاتح نے بھنچی بھنوؤں کے ساتھ ای میل کھولی۔

''آپ کی درخواست کے مطابق آپ کے بیان کی ویڈیو بھیج رہا ہوں۔''

ویڈیو چلائی تو جو منظر سامنے آیا اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ تعجب اور بے یقینی سے وہ خود کو اسکرین پہ بولتے دیکھ رہا تھا۔ تھکا ماندہ زخمی سا فاتح اسی لباس میں بیٹھا لوٹے جانے کا واقعہ بتا رہا تھا.... پھر اس نے کہا کہ لٹیروں نے اسے انجکشن لگایا تھا جس سے اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا.... ایسے جیسے وہ بار بار بھول رہا ہو۔

''تو یہ ہوا تھا رات کو؟'' وہ بے یقین تھا۔ ''مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیا میں بوڑھا ہو رہا ہوں؟ یا شاید.... کوئی غنودگی کی دوا انہوں نے مجھے دی تھی؟ یا اللہ!''

اس نے کراہ کے سر جھٹکا۔ یہ پستول دکھا کے لوٹ لینے والا واقعہ اسے کیوں نہیں یاد تھا؟ عجیب بات تھی.... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ موبائل نکال کر

آفیسر کو کال کرے مگر.... موبائل کہاں گیا....

اچھا ہاں' ویڈیو کے مطابق وہ چور لے گئے تھے۔ عجیب بات تھی۔ بہت عجیب بات تھی۔

پھر اس نے برآمدے کی دیوار پہ آویزاں گھڑی دیکھی۔ آج پارلیمان کا اجلاس تھا۔ اور وہ ناغہ کر چکا تھا۔ اُف۔ ساری باتیں ذہن سے نکلنے لگیں۔ شدید غصہ اور فرسٹریشن چھانے لگی۔ اسے جلد از جلد واپس پہنچنا تھا۔

دوپہر تک وہ واپس گھر پہنچا تو عصرہ اور بچے لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو سکندر اسے دیکھتے ہی بھاگتا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ کسی زخم پہ سکندر کا ہاتھ لگ گیا اور اسے شدید درد ہوا مگر وہ ضبط کر گیا اور جھک کے اسے پیار کیا۔

"ڈیڈ...! مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ آپ واپس نہیں آئیں گے۔ کھو جائیں گے۔" وہ اس سے لپٹے لپٹے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے اس کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا۔ "بڑے بھی کبھی کھو سکتے ہیں کیا؟"

"آریانہ بھی تو کھو گئی تھی۔ وہ تو ہم سے بڑی تھی۔"

فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بٹوہ غائب تھا۔ وہ پاپ کارن۔ وہ کھو چکے تھے۔

اس کے اندر ابال سا اٹھا مگر وہ ضبط کر کے رہ گیا۔

وہ چور یقیناً بٹوہ بھی لے گئے تھے۔ اف۔ اف۔

سکندر الگ ہوا تو فاتح نے چہرہ اٹھایا۔ عصرہ تعجب سے اسے دیکھتی قریب آ رہی تھی۔ "آنکھ پہ کیا ہوا؟ اور ہاتھ پہ؟"

"رات باتھ روم کے لیے اٹھا تو ٹھوکر لگ گئی۔ بے فکر رہو' کچھ نہیں ہوا۔ چند چوٹوں کے ساتھ بھی میں الیکشن لڑ سکتا ہوں۔"

مسکرا کے بات کرتا وہ اندر کی طرف بڑھا۔ جھوٹ بولنا اس کی فطرت نہیں تھی لیکن لوٹے جانے کا بتانا باعث توہین تھا۔ عصرہ نے الجھ کے اسے جاتے دیکھا' پھر کندھے اچکا دیے۔ وہ ایک ہی دن میں اتنا کمزور لگ رہا تھا۔ رنگت کملائی ہوئی تھی۔ شاید زیادہ ساحل پہ بیٹھ گیا ہو اس لیے رنگ سنولا ہو گیا ہو۔

"یہ تمہاری گردن پہ کیسا نشان ہے۔" کمرے کے دروازے پہ اس کے قدم رک گئے۔ گردن کی پشت کو ہاتھ سے چھوا۔ کچھ ابھرا کھدرا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

"کہا نا' گر گیا تھا۔"

"یہ گرنے کا نشان تو نہیں لگتا۔" عصرہ قریب آنے لگی تو وہ بے زاری سے "مجھے آرام کرنے دو" کہہ کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ عصرہ کے منہ پہ بند کیا تو اس کے ابرو تن گئے۔ ہونہہ کہہ کر سر جھٹکا اور مڑ گئی۔

اندر آتے ہی اس نے بتی جلائی۔ پھر سنگھار میز تک آیا۔ دراز سے پاکٹ مرر نکالا اور آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ننھا آئینہ گردن کی پشت پہ رکھ کے اور بڑے آئینے میں عکس دیکھا۔

وہاں گول سا جلنے کا نشان تھا جو بھورا پڑ چکا تھا۔

یہ چوٹ اسے کب لگی؟ اتنا صاف گول نشان؟

اس نے آئینہ پرے پھینکا اور نڈھال سا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

شام کو وہ کے ایل میں واقع ایک پرائیویٹ کلینک میں بیٹھا تھا۔ ماتھے پہ بل تھے اور چہرے سے ناخوش لگتا تھا۔ سخت بے زار۔

سامنے بیٹھا ادھیڑ عمر ڈاکٹر دونوں ہاتھ اٹھائے اس کو سمجھا رہا تھا۔

"میں نے آپ کے سارے زخم دیکھے ہیں' اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے واضح بتائیں کہ یہ آپ کو کب آئے؟"

"میں بتا رہا ہوں اتنی دیر سے کہ کل رات تین لوگوں نے چوری کی کوشش کی تو میں نے مزاحمت کی۔ اس پہ انہوں نے مجھے مارا۔" اس نے پولیس کو دیا بیان دہرا دیا۔

"حیرت انگیز۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔ "ڈریسنگ ہو گئی ہے' دوا بھی دے دی ہے میں نے آپ کو۔ مرہم کا بھی سمجھا دیا ہے' مگر....." اس نے توقف کیا۔ "یہ زخم کل کے نہیں ہیں۔"

"تو پھر کب کے ہیں؟"

"کم از کم بھی چار سے پانچ دن پرانے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کسی نے آپ کو لوہے کی زنجیروں سے مارا ہو۔ آپ کے ہاتھ باندھے گئے ہوں۔ کمر پہ چمڑے کے کوڑے یا ہنٹر سے مارے جانے کے نشان ہیں لیکن....." ڈاکٹر نے پھر توقف کیا۔ "مجھے آپ کی کمر پہ پرانے نشان بھی ملے ہیں۔ کم از کم تین سے چھ ماہ پرانے نشان۔ وہ بھی مار پیٹ کے ہیں اور یہ گردن کا زخم' اس کو بھی کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ یہ تو صاف گرم چیز سے داغے جانے کا نشان ہے۔"

وہ جواب میں ذرا جھنجھلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے مگر یہ کل کے ہی ہیں۔"

"مگر اتنی جلدی کھرنڈ کیسے بن سکتے ہیں' فاتح صاحب؟" پھر فاتح کا ناخوش چہرہ دیکھ کے بات بدل دی۔ "خیر آپ فکر نہ کریں' دوا لیتے رہیں' مرہم لگاتے رہیں' یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اسے لگا شاید فاتح چھپا رہا ہے سو مزید زور نہیں دیا۔ وان فاتح ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔

کلینک سے نکل کے وہ پارکنگ تک آیا تو رک گیا۔ ایک نظر سامنے سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا۔ پھر رک کے کچھ محسوس کرنا چاہا۔

کیا تھا جو طبیعت پہ ناگوار گزر رہا تھا؟ یہ زن سے بھاگتی دوڑتی گاڑیاں؟ یہ شور؟ یہ اس لباس میں ملبوس آگے پیچھے جاتے مصروف سے لوگ؟ سب ویسا ہی تھا جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ پھر سب اتنا اجنبی اجنبی کیوں لگ رہا تھا؟

سوال بہت سے تھے' مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

عصرہ کی نیلامی کے پہلے روز تک وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ بڑھتی عمر' دماغ پہ چوٹ' یا ڈرگ انجیکٹ کرنے کے باعث یقیناً وہ اس رات کے واقعات بھول چکا تھا۔ ایسا ہوتا ہے۔ ٹراما کے باعث انجری سے ذرا دیر پہلے کے واقعات بھول جایا کرتے ہیں۔ اس نے سوچوں کو اس واقعے سے ہٹا کر کام کی طرف مبذول کر دیا۔ البتہ رات میں آریانہ اکثر آ جاتی اور بیڈ کے کنارے کھڑے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا کرتی۔

"ڈیڈ.... ذہن اتنا خالی خالی سا کیوں ہے؟ جیسے کچھ ہوا ہو۔ جیسے بہت کچھ ہوا ہو مگر یاد نہ آ رہا ہو۔"

"ایک رات میں کتنا کچھ ہو سکتا ہے آخر؟" وہ سر جھٹک کے کہتا اور کروٹ لے لیتا۔ نرم بستر نامانوس کیوں لگتا تھا؟ اسے سخت بچھونے کی عادت بھی نہیں تھی نہ زمین پہ سونے کی۔ پھر اب....؟ لیکن وہ بار بار سر جھٹک دیتا۔

نیلامی کے پہلے روز پارٹی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ اسے وہ نظر آ گئی۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس سنہرے بالوں والی سوشلائیٹ جس کو اس روز عصرہ نے ملاکہ والے گھر بلوا کے اس کی چھٹی بدمزہ کر دی تھی۔ فاتح جانتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے پیچھے ہے اس لیے اسے دوٹوک انداز میں منع کر کے وہ دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ البتہ اسے یوں لگا جیسے وہ شل ہو گئی ہو۔ طبیعت کے برخلاف کوئی تیکھا جواب بھی نہیں دیا۔ خیر.... وہ آگے بڑھا تو ایڈم نظر آیا۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ ایڈم اس رات کچھ کہنے آیا تھا۔

فاتح نے رک کے اس سے سوال کیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح کم اعتماد نظر آنے لگا۔ جیسے الجھ گیا ہو۔ شاید اسے اس رات کے واقعات کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک باڈی مین کے سامنے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے کہ وہ ذہنی طور پہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ لوٹے جانے کے اس واقعے کو بھول جائے۔

اونہوں۔ اسے اپنے استفسار پہ پچھتاوا ہوا سو بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔

پارٹی کی رونق اپنے عروج پہ تھی۔ دو روزہ نیلامی میں آج آدھے آئٹمز رکھے گئے تھے۔ باقی آدھی اور زیادہ قیمتی چیزیں عصرہ نے کل کے لیے بچا رکھی تھیں۔ وہ کال سننے مہمانوں سے ذرا الگ ہوا تو سیکرٹری عثمان قریب آیا اور سرگوشی کی۔

”سر وہ پیسے میں اب ادا کر دوں ایڈم کو؟“

وان فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”کون سے پیسے؟“

”سر! جو آپ نے میرے اکاؤنٹ میں آن لائن بھجوائے تھے۔ اس رات جب آپ ملاکہ میں تھے اور آپ نے مجھے کال کر کے کہا تھا کہ سیل فون کھو گیا ہے تو میں آپ کے لیے نیا فون اور نئی سم لے لوں۔“ وہ وضاحت دیتے دیتے خود بھی حیران نظر آنے لگا۔

”ہاں ہاں.... رائٹ۔“ وہ سنبھل کے مسکرایا۔

”تو تم وہ پیسے ایڈم کو کیا کہہ کے دو گے؟ کیوں دے رہے ہو اسے یہ؟“

”سر وہی جو آپ نے کہا تھا کہ اس کو معلوم ہے یہ کس چیز کے ہیں۔ آپ نے اصل میں صبح سے پہلے ٹرانسفر کا کہا تھا مگر مجھے اس کا اکاؤنٹ نمبر نہیں معلوم تھا اس لیے دیر ہو گئی۔“

”ہاں! ابھی دے دو پھر۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کے گلاس سے گھونٹ بھرتا مڑ گیا البتہ ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پھر سے ابھرنے لگے تھے۔

سوموار کو اس کی واپسی پہ عثمان نیا فون اور سم کارڈ لے کر جب آیا تو اس نے یہ بتایا تھا کہ یہ حکم آدھی رات کو اسے فون کر کے فاتح نے ہی دیا تھا' مگر عصرہ سامنے تھی تو عثمان نے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہیں کھڑے کھڑے فاتح نے فون نکالا اور اپنا بینک اکاؤنٹ پورٹل کھولا۔ پھر آخری ٹرانزیکشن چیک کی۔ بیس ہزار رنگٹ۔ اس کی آنکھیں تعجب سے کھل گئیں۔ اس نے بیس ہزار کیوں بھیجے ایڈم کو؟ ٹرانزیکشن کرتے وقت یادداشت کے لیے جو نوٹ لکھا جاتا ہے' فاتح نے وہ نوٹ کھولا۔ وہاں ایک سطر لکھی تھی۔

فار چا کلیٹس

کیا یہ ٹرانزیکشن میں نے ہی کی ہے؟ مگر کسی اور کو میرا پاس ورڈ نہیں معلوم۔ اور عثمان کو جب میں نے خود فون کر کے کہا ہے تو... اوہ خدایا۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔

گلاس ایک قریبی میز پہ رکھا اور لوگوں کے درمیان سے گھاس پہ راستہ بناتا آگے بڑھنے لگا۔ اسے شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

اندر لاؤنج میں بھی چند لوگ آ جا رہے تھے جو کسی ضرورت سے اندر آئے تھے یا ملازم تھے۔ وہ سب کو نظر انداز کرتا لاؤنج کے پرلے کونے پہ بنے پاؤڈر روم کی طرف بڑھا۔ (یہ ایسا کمرہ تھا جس میں بڑا سا آئینہ دیوار پہ لگا کے سامنے سنک بنے تھے۔ یہ صرف مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لیے تھا۔ باتھ روم کے طور پہ استعمال کرنے کے لیے نہیں۔)

دروازے کا ناب گھمایا اور اسے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تیز زرد بتیاں جلی تھیں۔ دیوار گیر آئینے کے سامنے ماربل کا بڑا سا سلیب تھا جس میں فاصلے پہ دو سنک بنے تھے۔

ایک سلیب پہ ہتھیلیاں جمائے وہ جھکی کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ سرخ ساڑھی اور سنہری بالوں والی تالیہ۔

”سوری۔ میں باہر جا رہا ہوں۔“ وہ واپس ہونے لگا تو تالیہ نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ آئینے میں اپنے عکس کے عقب میں چوکھٹ پہ دروازہ پکڑے فاتح کو دیکھا اور فاتح نے بھی آئینے میں اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹکا۔

اس کے گال آنسوؤں سے بھیگے تھے اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ جیسے جسم میں خون کا قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔ شاید کافی دیر سے رو رہی تھی۔ کاجل بہہ گیا تھا۔ اسے عکس میں دیکھ کے بالکل ٹھہر گئی۔ فاتح نے ابرو تعجب سے اکٹھے کیے۔

”تم ٹھیک ہو' تاشہ؟“ رسمی سا پوچھا۔

تالیہ نے ٹشو رول سے لمبا سا ٹشو کھینچا' اور اس کے قریب آئی۔ فاتح نے دروازہ چھوڑ کے راستہ دیا۔ تالیہ نے بے دردی سے آنکھیں رگڑیں اور ایک دکھ

بھری نظر اس پہ ڈالی۔

”میرا نام.... تالیہ ہے۔ تالیہ بنت مراد۔“ تکلیف سے چبا چبا کے بولی۔

”ہاں' واٹ ایور' تاشہ! تم آرام سے منہ دھو لو۔ میں اپنے باتھ روم کی طرف جا رہا ہوں۔“ وہ پیچھے ہٹنے لگا تو وہ گلوگیر آواز میں چیخ کے بولی۔

”آپ یہیں رہیں۔ آپ اپنی صحیح جگہ پہ کھڑے ہیں۔ میں ہی غلط جگہ پہ کھڑی تھی۔ مجھے جانا چاہیے۔ آپ کو آپ کا گھر اور یہ زندگی مبارک ہو۔“ دکھ اور تنفر بھری نظروں سے اسے دیکھتی وہ پیر پٹختی آگے بڑھ گئی تو فاتح نے اچنبھے سے اسے جاتے دیکھا۔

”ہاؤ روڈ!“ پھر سر جھٹک کے آگے چل دیا۔

ایڈم لان کے سرے پہ کھڑا عثمان سے بات کر رہا تھا جب وہ اندر سے آتی دکھائی دی۔ عثمان نے اسے ایک پھولا ہوا لفافہ تھمایا اور بے زاری سے چند جملے کہہ کے پلٹ گیا۔ تالیہ قریب آئی تو نڈھال لگتی تھی۔

”عجیب بات ہے۔ وان فاتح نے یہ پیسے مجھے کیوں بھجوائے ہیں؟“ وہ حیران سا اس سے پوچھنے لگا۔ ”میں نے پوچھا یہ کب بھیجے ہیں انہوں نے تو وہ بولا کہ اتوار کی رات کو کہا تھا' یعنی جب ہم واپس آئے تھے یعنی ان کی یادداشت جانے سے پہلے انہوں نے....“

”ایڈم.... پلیز.... مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ وہ اس کو نہیں سن رہی تھی۔ ایڈم نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا میک اپ منہ دھونے کے باعث ہلکا ہو گیا تھا۔ کاجل کچھ بہہ گیا تھا۔ اور آنکھوں کے کٹورے بار بار پانی سے بھر رہے تھے۔

”چے تالیہ.... خود کو سنبھالیں۔“ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”مجھے اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ بس تم کار اسٹارٹ کرو۔“ اس نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ”میں عصرہ کو الوداع کہہ دوں۔“

ایڈم کو وہیں چھوڑ کر وہ عصرہ کی طرف جانے لگی۔ وہ لان کے دوسرے دہانے پہ کھڑی مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ چند گز کا فاصلہ بھی اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ قدم بھاری بھاری سے ہونے لگے۔ وہ بدقت چلتی قریب آئی۔ جسم اتنا نڈھال تھا کہ لگتا تھا ابھی گر پڑے گی۔

”عصرہ.....“ اس کے پکارنے پہ مسکراتی ہوئی عصرہ مڑی تو اس کی شکل دیکھ کے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”تالیہ تم ٹھیک ہو؟“ اسے تشویش ہوئی۔

”نہیں۔ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔ بہت معذرت۔“ وہ بدقت اپنے وجود کو مجتمع کیے بول رہی تھی۔

”اوہ.... ابھی تو تمہارے بنائے میرے پورٹریٹ کی نیلامی بھی ہونا تھی۔“

”میں نہیں رک سکتی۔ پلیز۔“

”اٹس او کے۔ کل آ جانا۔ ویسے بھی گھائل غزال تو کل ہی لگے گی۔“

مگر اس کی بلا سے اب گھائل غزال اور عصرہ کے ساتھ جو بھی ہو۔ اسے اب کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ بس ایک دل تھا جو رک رک کے دھڑک رہا تھا۔ سارے مسئلے اس دل کے ہی تو تھے۔

راستے میں ایڈم خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا اور وہ چپ چاپ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ آنسو بنا آواز کے بہہ رہے تھے۔ ایڈم بار بار ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کے اسے دیکھتا' مگر کچھ کہہ نہ پاتا۔ پھر اس نے کوشش کی۔

”مجھے نہیں معلوم ان کا زیادہ بڑا جرم کیا ہے۔“ اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ”وہ پانی پی لینا' ہمیں بے خبر رکھنا یا آپ کو آزاد نہ کرنا۔ پتا نہیں وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں لیکن اگر وہ ہمیں اس طرح اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں تو نکالنے دیجیے۔ دکھ مجھے بھی ہے اور دماغ شل ہے لیکن میں نے بھی ان سے لمبی امیدیں نہیں باندھی تھیں۔ اس لیے اب ہمیں بھی اپنی عام زندگیوں میں واپس چلے جانا چاہیے۔“

”ایڈم گاڑی روکو۔“ وہ ایک دم بلند آواز سے رونے لگی تو ایڈم نے جلدی سے کار آہستہ کی پھر اسے

سڑک کنارے کھڑا کیا۔ وہ مصروف شاہراہ تھی اور کنارے پہ فٹ پاتھ بنے تھے جن کے ساتھ کھجور کے درخت قطار میں لگے تھے۔ وہ درخت کے سائے تلے رک گئے جہاں شاخوں کے جھروکوں سے ڈوبتا سورج دکھائی دے رہا تھا۔

''وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ ''وہ مجھے یوں اکیلا کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ مجھے پہچان کیوں نہیں رہے؟ وہ مجھ سے پہلے کی طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔''

''چے تالیہ.... ان کو کچھ یاد نہیں ہے۔''

''مگر میں نے ان کو خود بتایا تھا۔ جنگل میں ساری کہانی سنائی تھی ان کو۔ اور تم نے ان کو خزانے کا بتایا تھا' جب تم ان کو میرے پاس سن باؤ کے گھر لائے تھے۔ مجھے پکڑنے کے لیے۔ پھر ان کو کیوں نہیں یاد؟'' وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''وہ سب چابی جوڑنے کے بعد ہوا تھا۔ جب میں کار میں ان کے ساتھ بیٹھا تو بات شروع کرنے سے قبل میں نے ان کو چابی دے دی تھی جس کو انہوں نے فوراً جوڑ دیا تھا۔ آپ کا خزانے کی تلاش میں آنا' اور ہمارا دروازہ پار کرنا' یہ سب بعد میں ہوا تھا۔''

''میں نے ان کو سب بتایا تھا جنگل میں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ''اپنے بارے میں' حالم کے بارے میں' اشعر کی گھائل غزال سے متعلق سازش' عصرہ کا فائل چرانا' سب بتایا تھا۔''

''مگر ان کو یہ سب نہیں یاد۔ ان کی یادداشت میں آپ صرف ایک بگڑی امیر زادی ہیں جس نے ان کی فائل چرائی تھی۔''

''اور ان کے احساسات کا کیا؟ کیا یادداشت جانے سے وہ بھی ختم ہو گئے؟'' وہ بے یقینی بھری گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے نہیں پتا' چے تالیہ۔ مگر احساسات تو یادوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی تو مراد راجہ سے کبھی وہ انسیت محسوس نہیں ہوئی جو وقت کا سفر کرنے سے قبل چھوٹی تالیہ کو تھی۔''

''نہیں۔'' اس نے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا اور نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ سب ان کا کوئی پلان ہے۔ وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ ان کو سب یاد ہے۔''

''وہ جھوٹ نہیں بولتے۔''

''نہیں۔ میں نہیں مانتی۔ زندگی مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتی۔ قسمت میرے ساتھ اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

''آپ denial میں ہیں۔'' اس نے افسوس سے تالیہ کو دیکھا۔ وہ روتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''میں نہیں مانتی۔ میں اتنی بری تو نہیں تھی کہ میرے ساتھ یہ سب ہوتا۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ سنا تم نے۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ مجھے یوں پہچاننے سے انکاری نہیں ہو سکتے۔''

''چے تالیہ.....''

''وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ وہ عصرہ سے ڈرتے ہیں۔ میں ان کو دیکھ لوں گی۔ میں سب کو دیکھ لوں گی۔ میں ان سے بات کروں گی۔'' پھر اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں۔ ''ابھی لوگ تھے نا سامنے۔ کل میں ان سے اکیلے میں بات کروں گی۔ دیکھنا' وہ تب وضاحت کریں گے کہ ان کا رویہ ایسا کیوں تھا۔''

''شاک ملنے کے بعد پہلا فیز denial (نہ ماننے) کا ہوتا ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)